اردو نظموں کا احتجاجی آہنگ

(انتخاب مع مقدمہ)

شہزاد انجم برہانی

اردو نظموں کا احتجاجی آہنگ

(انتخاب مع مقدمہ)

شہزاد انجم برہانی

B

براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی

URDU NAZMON KA EHTIJAJI AAHANG

Compiled By

SHEHZAD ANJUM BURHANI

SBIN:978-93-83558-25-4

ایڈیشن	:	2017
قیمت	:	₹ 200
کاغذ	:	80جی ایس ایم اسٹار
سرورق	:	براؤن گرافکس، علی گڑھ
مطبع	:	APAC Business Solutions، نئی دہلی۔110002
ناشر	:	براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی۔110025

www.brownbooks.in

+91 9818897975

تقسیم کار:

- براؤن بکس، علی گڑھ
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ
- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، علی گڑھ

انتساب

استاذی

پروفیسر ابوالکلام قاسمی صاحب

کے نام

'ایک ذرے کو سنوارا یوں کہ انجم کر دیا'

فہرست

مقدمہ

شعروادب کی تخلیق کا محرک وہ تمام اسباب ہوتے ہیں، جو شاعر یا فن کار کی طبیعت میں ہیجان برپا کرتے ہیں۔ زندگی اور زمانہ میں پیش آنے والے ہر عمل پر ردعمل کا نتیجہ کسی بھی ادبی تخلیق کے لیے جواز فراہم کرتا ہے۔ لہٰذا اس پس منظر میں ادب بجائے خود احتجاج اور مزاحمت کا نتیجہ قرار پایا۔ چونکہ عام آدمی کے مقابلے میں تخلیق کار زیادہ حساس ہوتا ہے تاہم وقت اور حالات کے جبر کے خلاف اس کے محسوسات کی شدت اور اس کا ذاتی تجربہ، مشاہدہ اسے منحرف اور باغی بناتے ہیں۔

احتجاج دراصل ناموافق صورت حال سے اعتراض یا انکار کی صورت میں شاعر یا تخلیق کار کا غیر مطمئن ہونا ہے، جبکہ ناموافق صورت حال کو بدلنے پر اصرار اور کسی مخصوص نظام کو توڑنے یا درہم برہم کرنے کا جذبہ مزاحمت کے زمرے میں شامل ہے۔

شاعری میں احتجاج اور مزاحمت کے نمونے اردو زبان وادب کے ابتدائی دور سے ملنا شروع ہوجاتے ہیں۔ اردو ادب کے آغاز کا زمانہ ہندوستان میں سیاسی، معاشی، معاشرتی خلفشار کا زمانہ ہے لہٰذا اس زمانے میں دکن میں لکھے گئے رزم ناموں کی بات کی جائے یا پھر شمالی ہند میں لکھے گئے شہر آشوب کی، یہ سب مزاحمتی اور احتجاجی شاعری کی روایت کے طور پر ہمارے کلاسیکی سرمائے میں موجود ہیں۔

شمالی ہند میں جعفر زٹلی وہ پہلا شاعر قرار دیا جاسکتا ہے، جس کے یہاں اپنے عہد کے سماجی اور سیاسی نظام کے خلاف ناآسودگی اور بھرپور احتجاج اور مزاحمت کے نمونے موجود ہیں۔ زٹلی نے جو شہر آشوب لکھے یا جو ہجو یہ قصائد اس کے کلام میں موجود ہیں اس میں احتجاج اور مزاحمت کا انداز ملتا ہے۔ ہر چند کہ زٹلی نے جس زمانے میں احتجاج کی آواز بلند

کی اس وقت کسی بھی نظام کے خلاف آواز اٹھانے کا مطلب جان گنوانے کے مترادف تھا مگر اس کے باوجود بھی زٹلی جیسا حقیقی فنکار ایسے کسی انجام کی پروا کیے بغیر اپنے قلم کے ذریعہ احتجاج اور مزاحمت سے لبریز کلام لکھتا رہا۔

گیا اخلاص عالم سے عجب یہ دور آیا ہے
ڈریں سب خلق ظالم سے عجب یہ دور آیا ہے
نہ یاروں میں رہی یاری، نہ بھائیوں میں وفاداری
محبت اٹھ گئی ساری، عجب یہ دور آیا ہے
نہ بولے راستی کوئی، عمر سب جھوٹ میں کھوئی
اتاری شرم کی لوئی عجب یہ دور آیا ہے
(جعفر زٹلی)

جعفر زٹلی کے علاوہ اس زمانے میں ہر بڑے اور اہم شاعر کے یہاں احتجاجی اور مزاحمتی انداز کا کلام دستیاب ہے۔ جس سے نہ صرف اس عہد کے حالات سے واقفیت ہوتی ہے بلکہ احتجاجی اور مزاحمتی شاعری کے قابلِ قدر نمونوں کو بھی نشان زد کیا جاسکتا ہے۔ غزل کے برخلاف اس عہد میں شہر آشوب ہی کی ہیئت اور صنف مزاحمتی کلام کے لیے موزوں تھی۔ اس لیے بیشتر شاعروں نے شہر آشوب ہی میں اپنے احتجاجی رویوں کو پیش کیا۔ جن میں میر تقی میر، مرزا محمد رفیع سودا، غلام ہمدانی مصحفی، قیام الدین قائم، نظیر اکبر آبادی سے لے کر آزاد، حالی، داغ دہلوی وغیرہ تک شہر آشوب کی شکل میں احتجاجی شاعری کی روایت پھیلی ہوئی ہے۔ غزلیہ شاعری میں اس طرح کے مزاحمتی رویوں کی جھلک موجود ہے لیکن نظموں میں احتجاج کے پیش نظر یہاں شہر آشوب کا حوالہ غیر ضروری معلوم نہیں ہوتا۔

کیسا یہ شہ ہے ظلم پر اس کی نگاہ ہے — ہاتھوں سے اس کے ایک جہاں دادخواہ ہے
لچا ایک آپ ساتھ لٹیری سپاہ ہے — ناموسِ خلق سائے میں اس کے تباہ ہے
شیطان کا یہ ظل ہے نہ ظل اللہ ہے
(قیام الدین قائم)

یہاں کے قاضی و مفتی ہوئے ہیں رشوت خور　　یہاں کے دیکھ لو سب اہل کار ہیں گے چور
یہاں کرم سے نہیں دیکھتے ہیں اور کی اور　　یہاں سبھوں نے بھلائی ہے دل سے موت اور گور
یہاں نہیں ہے مداوا، بغیر دار و مدار
(شیخ ظہورالدین حاتم)

آزادی سے قبل ترقی پسند تحریک وہ بنیادی حوالہ ہے جس نے مکمل طور سے اپنے اصولوں کے مدنظر احتجاج و مزاحمت کی بات کی۔ اس سے پہلے زندگی کے مختلف شعبوں میں پائی جانے والی کمیوں کو اتنا واضح انداز میں پیش کرنے کا رویہ اور مزاحمت کی اتنی نمایاں مثالیں نہیں ملتیں، جو ترقی پسندوں کے زیر اثر سامنے آئیں کیوں کہ اس تحریک کے حامیوں نے داخلیت سے زیادہ خارج میں رونما ہونے والے واقعات و حادثات پر پوری توجہ صرف کی۔ ان تمام باتوں کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا، جو سماج کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہیں اور تفریق کو بڑھاوا دیتی ہیں۔ یعنی علی گڑھ تحریک کے بعد ترقی پسند تحریک نے شعوری طور پر اپنے اصول وضع کیے اور زبان، اسلوب اور اظہار کے پیمانے بدل دیئے۔ بیانیہ طرز کو زیادہ اہمیت دی، علامتی اور استعاراتی اسلوب سے احتراز کیا۔ اس کی اہم وجہ یہ تھی کہ ان کے سامنے حقیقت کی ترجمانی اور انسانی فلاح و بہبود کا مقصد کارفرما تھا۔ جس کے لیے کسی ادبی اصول کی پابندی کو بھی اس کے پیروکاروں نے اہم نہیں مانا۔ یہی وجہ تھی کہ اپنے اصولوں اور مقاصد کے پیش نظر ترقی پسندوں نے قدامت پرستوں پر لعن طعن کی اور کلاسیکی سرمایۂ غزل پر اعتراض کیا۔ ان تمام باتوں کے باوجود ترقی پسند تحریک کے تخلیق کاروں کا اہم کارنامہ اردو میں مزاحمتی اور احتجاجی شاعری کی روایت کو مستحکم کرنا ہے۔

آزادی کے بعد خاص طور سے تقسیم کا زمانہ ہندوستان اور پاکستان کی تاریخ میں اہم موڑ ثابت ہوا۔ تقسیم کے دل دہلا دینے والے واقعے کے نتیجے میں خوابوں کی شکست و ریخت، نقل مکانی، قتل فسادات، غارت گری کی فضا نے ایک نئی تاریخ رقم کی۔ دوسری طرف

عالمی پیمانے پر ہونے والی تبدیلیاں زندگی کے ہر شعبہ پر اثر انداز ہو رہی تھیں۔ ادبی طور پر ترقی پسند تحریک کے اثرات میں کمی اور اس کے زوال کے ساتھ ہی جدید عہد کا آغاز ہو رہا تھا۔ شاعری کے موضوعات میں تنوع اور وسعت پیدا ہو رہی تھی۔ تقسیم کے سانحے نے انسان کے اندر خوف اور عدم تحفظ کے احساس کو بڑھاوا دے کر بے یقینی کی کیفیت پیدا کردی۔ نتیجتاً ہر عقیدہ، نظریہ، فلسفہ پر شک و شبہ کی لکیریں کھنچنا شروع ہو گئیں۔ پرانی قدریں، اخلاقی اصول و ضابطے انسان کو کمزور کرتے جا رہے تھے اور اس کے اندر کی بے چینی اسے ایک نئے ماحول اور نئی دنیا کی طرف لئے جا رہی تھی۔ انسان ایک ایسے معاشرے کی تلاش میں سرگرداں تھا جہاں اس کی آرزوؤں کو پناہ مل سکے۔

۱۹۶۰ء کی دہائی میں جو شعرا منظر عام پر آ رہے تھے ان کے سامنے نئے مسائل، نئی پیچیدگیاں ترقی پسند تحریک کے زمانے سے مختلف الجھے ہوئے تقاضوں کی مختلف النوع وجوہات کی غماز تھیں۔ اس لیے جدید رجحانات کے نمائندہ شاعروں نے ترقی پسندوں کے محض بیانیہ طرزِ اظہار، خارجی موضوعات اور حلقہ ارباب ذوق کے نمائندہ شاعروں کی قطعی داخلی کیفیات سے اجتناب کرتے ہوئے وقت اور حالات کے تحت درپیش مسائل کو اپنے تجربات و مشاہدات کے حوالے سے پیش کرنے کی کوشش کی۔ ان شاعروں کا طرز احساس، ان کا رویہ نئے حقائق کی تلاش کر رہے تھے اور ساتھ ہی وہ اپنے وجود اور اس کی معنویت کے انکشافات کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

جہاں تک آزادی کے بعد کی شاعری میں احتجاج و مزاحمت کے رویوں کی بات ہے تو آزادی کے بعد شاعروں کے یہاں فکری سطح پر وسعت اور ہمہ گیری کا احساس بھی ہوتا ہے۔ وقت کے تقاضوں کے تحت ان کا طرز اظہار بھی علامتی اور استعاراتی انداز و بیان کی نمایاں مثال ہے۔ عالمی پیمانے پر رونما ہونے والے واقعات کو بھی آزادی کے بعد شاعروں نے اپنی شاعری میں خاص اہمیت دی ہے۔

چونکہ آزادی کے بعد غزلیہ شاعری میں بھی احتجاج اور مزاحمت کے رویوں کی

نشاندہی کی جا سکتی ہے لیکن شعر میں دو مصرعوں کی قید کے سبب کسی بات کو وضاحت کے ساتھ پیش کرنا دقت طلب امر ہے۔ غزل کے شعروں کے مقابلے نظموں میں ناموافق صورت حال کے خلاف احتجاج اور مزاحمت کے رویوں کو قدرے توضیحی انداز میں پیش کیا جا سکتا ہے، اسی لیے احتجاجی موضوعات کے پیش نظر نظموں کو اہمیت دی گئی ہے۔

تقسیم کے بعد کی شاعری میں علاقائیت اور وطنیت کے موضوعات سے اوپر اٹھ کر عالمی موضوعات و مسائل بھی زیر بحث آئے ہیں۔ سیاست، معاشرت کے علاوہ مذہب کے اصولوں پر بھی شاعروں نے انحراف کا رویہ برتا ہے۔ مذہبی فلسفہ کا نیا آہنگ جدید شاعروں کے یہاں ان کی فکری بلندیوں کا غماز ہے۔ ظلم و جبر کے خلاف سوچنے، محسوس کرنے اور اظہار کا سلیقہ انہیں ہر وابستگی سے آزاد اور کھلی فضا میں سانس لینے کا ہنر سکھاتا ہے، ہر شاعر کا ذاتی تجربہ اور احساس اس کی عدمِ وابستگی کی عمدہ مثال بھی ہے۔

خدا کی بنائی ہوئی اس وسیع و عریض کائنات میں وجود کا مسئلہ اس کی اہمیت، تشخص، وجود کی تلاش معلوم سے نامعلوم کی طرف مراجعت، انجانی چیزوں کا خوف، ہر قدم موت کی طرف بڑھتی ہوئی زندگی نے فنکار کو عجیب طرح کی بے اطمینانی میں مبتلا کر دیا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی تخلیقات میں سوالات کا قائم ہونا فطری امر ہے۔ اگر بغور دیکھا جائے تو ہر شاعر کے یہاں یہ کشمکش محسوس کی جا سکتی ہے۔ وہ ایک انجانی خواہش اور کشمکش میں مبتلا کبھی خود کلامی کبھی خطاب کے انداز میں اس کشمکش اور بے چینی کا اظہار کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

تقسیم کے بعد مابعد جدیدیت کے رجحان کے تحت تانیثیت کی بحث بھی شروع ہوئی اور یہ زمانہ ادب و شاعری میں تانیثی فکر کی نمائندہ لکھنے والی شاعرات کو بھی سامنے لاتا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں بعض اہم شاعرات تانیثی رویوں کو منظر عام پر لانے اور اردو شاعری میں اس مکتب فکر کو پروان چڑھانے میں کامیاب ہوئی ہیں۔ تانیثی فکر کی نمائندہ ادیبوں نے سماج کے ہر شعبے میں نسائی امیج کو برقرار رکھنے اور عورت و مرد کے مابین تفریق کو ختم کرنے پر زور دیا ہے۔ مرد کے شانہ بہ شانہ عورت کو بھی اپنے

وجود کا اثبات کرانے کی آزادی دی گئی ہے اور اسے ہر طرح کی ذہنی وفکری، معاشی و سیاسی، سماجی و اقتصادی آزادی کی بات اور تمام حقوق دیئے جانے کا مطالبہ ادب کا موضوع بنا ہے۔ لہٰذا اس انتخاب میں جن شاعرات کو شامل کیا گیا ہے ان کے یہاں تانیثی فکر کی نمائندہ نظموں کو اہمیت دی گئی ہے۔

زیر نظر کتاب کا محرک آزادی کے بعد شاعروں کی تخلیقات میں پائی جانے والی متنوع کیفیات، رنگارنگی اور سریت ہے۔ چونکہ نظمیہ شاعری میں یہ رجحان واضح طور پر سامنے آتا ہے۔

احتجاجی شاعری کی بات کی جائے تو آزادی سے قبل ترقی پسند تحریک، شمالی ہند میں لکھے گئے شہر آشوب اور آزادی کے بعد بھی احتجاجی اور مزاحمتی شاعری سے متعلق بیشتر کلام موجود ہے۔ لیکن چونکہ انتخاب کی طوالت کے سبب ایسا کرنا ممکن نہیں ہے، لہٰذا آزادی کے بعد احتجاجی و مزاحمتی موضوعات سے متعلق نظموں کو اہمیت دیتے ہوئے انتخاب کیا گیا۔ ترقی پسند تحریک کے وہ اہم شاعر جو آزادی کے بعد بھی شاعری کرتے رہے، انہیں شامل کرلیا گیا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے حوالے سے یا موضوعاتی سطح پر جوش ملیح آبادی سے انکار مشکل ہے۔ مگر چونکہ جوش کا بیشتر احتجاجی اور مزاحمتی کلام (جو ترقی پسندوں کے لیے مثال کا درجہ رکھتا تھا) آزادی سے قبل ہی منظر عام پر آکر مقبول ہو چکا تھا۔ آزادی کے بعد بھی جوش نے شاعری کی مگر زیادہ تر انھوں نے مرثیوں کی طرف دھیان دیا، اس لیے تقسیم کے بعد جن ترقی پسند شاعروں کی نظموں کو اہمیت دی گئی ہے، ان میں جوش کو شامل نہیں کیا گیا ہے۔

چونکہ احتجاجی اور مزاحمتی موضوعات سے متعلق نظموں کو شامل کیا گیا ہے تاہم نظموں کے جو پرانے انتخابات سامنے آچکے ہیں ان سے حتی الامکان احتراز کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور نئی اور اہم نظموں کو شامل کرنے پر زیادہ توجہ دی گئی ہے مگر پھر بھی موضوع کی پابندی کے سبب پرانی کچھ نظموں کو نئی قرأت اور مطالعہ کی نئی جہت کے پیش نظر شامل کرلیا گیا ہے۔ لہٰذا

اس انتخاب کے بعد امید ہے کہ کتاب میں موجود مواد کی رنگارنگی اور خاص طور سے آزادی کے بعد پیدا ہونے والے رجحانات اور شاعروں کے رویے، طریقۂ اظہار، ان کے اسالیب و موضوعات کی بوقلمونی کے پیش نظر ہمارے اہم قارئین ضرور محظوظ ہوں گے۔

میری Ph.D. کے نگراں ابوالکلام قاسمی صاحب کے ساتھ ''آزادی کے بعد احتجاجی شاعری کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ'' کے عنوان کے تحت کام کر رہا ہوں، لہٰذا ان کے ہی مشورہ پر احتجاجی شاعری کے اچھے اور قابل قدر نمونوں کو ترتیب دے کر منظر عام پر لانے کا ارادہ کیا ہے۔ آپ نے نظموں کے انتخاب کے سلسلے میں اور موضوعات کے لحاظ سے احتجاج ومزاحمت کے پیش نظر اہم شاعروں اور ان کی نظموں کے بارے میں مفید مشوروں سے نوازا۔ اس لیے اس کتاب کی ترتیب میں استاد محترم کی معاونت اور صلاح ومشورہ کا بہت دخل ہے، جس کے لیے میں استاد کا ممنون ومشکور ہوں۔

شہزاد انجم برہانی علیگ
شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
07417862290-9039422271
sdanjumansari@gmail.com

دیباچہ

ابوالکلام قاسمی

ادب اپنی ماہیت اور مزاج کے اعتبار سے ان محرکات کا زائیدہ ہوتا ہے، جو انسانی ردعمل کی شدت پر مبنی ہوتے ہیں۔ عام تجربہ، اپنی مخصوص صورتوں میں ہی ادبی یا شعری تجربہ بن پاتا ہے۔ اس عمل میں تجربے کی نوعیت اور اس سے ادیب پر وارد ہونے والے تاثر کی شدت، دونوں کو دخل ہوتا ہے۔ مگر یہ بات بھی بڑی اہم ہے کہ جذبے یا حواس پر اثرانداز ہونے والے مظاہر یا معاملات، تخلیقی عمل کی جن پُر پیچ وادیوں سے گزر کر شعری متن کی صورت اختیار کرتے ہیں ان کی بڑی حد تک قلب ماہیت ہوجاتی ہے۔ اس مرحلے پر غور طلب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ ردعمل کی شدت، تخلیقی عمل کی تقلیب سے گزرنے کے بعد اپنا کیا کچھ کھودیتی ہے؟ اور اس بدلی ہوئی صورت میں احتجاج یا بغاوت یا انقلاب یا برہمی، اپنی اصل شکل میں قابل شناخت بھی رہ پاتی ہے یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب سوائے نفی کے اور کچھ نہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ احتجاج یا انقلاب کی نفسیات، شاعری کے تخلیقی عمل کی جدلیات سے بڑی حد تک مختلف ہوتی ہے۔ اس لیے توجہ کا ارتکاز اس نکتے پر ہونا چاہیے کہ احتجاج اور تخلیقیت کو مجتمع کر کے ایک ایسے آمیزے کی تشکیل کیوں کر ممکن ہے جو ردعمل کی سطح پر مزاحمت کے مفہوم کی نمائندگی بھی کرے اور شعری یا ادبی اظہار کے تقاضوں کی تکمیل بھی کرتا ہو۔

احتجاجی شاعری محض مزاحمت کے عنصر کی نمائندہ بھی ہوسکتی ہے اور انقلابی رویے کی حدوں سے ماورا ہو کر فنی پیرایے کا متبادل بھی بن سکتی ہے۔ ادب میں نقطۂ نظر کی اہمیت یا فکری دبازت سے انکار صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جو آج بھی 'ادب برائے ادب' کا موقف رکھتے ہوں مگر جس طرح شعر و ادب کا وظیفہ محض زندگی کی اصلاح یا تبلیغ تک محدود نہیں رکھا جا سکتا، اسی طرح شعر و ادب کو انسانی اور تہذیبی ذمہ داریوں سے یکسر لاتعلق بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس لیے کہ شدت جذبات جس طرح شعری اظہار کے توازن کو درہم برہم کر سکتی ہے، اسی طرح ہیئت پرستی کی انتہا پر پہنچ کر شاعری جذبے اور احساس سے عاری بھی ہوسکتی ہے۔ یوں تو عالمی ادب میں لایعنیت کا ایک طاقت ور رجحان بھی رو بہ عمل رہ چکا ہے۔ مگر اس لایعنیت کا پس منظر اگر معاصر صورت حال سے بے اطمینانی اور گفتار کی لاحاصلی کی صورت میں، ایک معاشرتی اور تہذیبی رویہ نہیں بن پاتا تو وہ لایعنیت یا اہمال بھی، ہوا میں معلق ادبی یا شاعرانہ کرتب بازی کے علاوہ کچھ اور قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہونی چاہیے کہ اگر احتجاجی شاعری پر شاعری کی تعریف کا اطلاق نہیں ہوسکتا تو وہ ہمارے معرض بحث کا حصہ نہیں۔ اس لیے کہ شاعری کے حوالے سے احتجاج صرف دانشورانہ نقطۂ نظر کی وضاحت نہیں ہوتا بلکہ اس کی شاعرانہ پیشکش کا ایک اسلوب بھی ہوتا ہے۔ یہ بات بھی درست ہے کہ شاعری سپاٹ طرز اظہار اور خطابت سے ان معنوں میں ہی ماورا ہو پاتی ہے کہ اس میں نقطۂ نظر کی دانشورانہ دبازت، شاعرانہ اظہار کی تہہ داری سے ہم آہنگ ہو جائے۔ دنیا کی بڑی زبانوں کی شاعری کو جانے دیجیے اگر اردو شاعری کی تاریخ میں محدود رہ کر بھی بات کی جائے تو نظریاتی وابستگی اور تخلیقی رویے کی شدت کے کئی انتہا پسندانہ میلانات پر ہماری نگاہ رکتی ہے۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ ہمارے ادب میں کبھی سماجی اور معاشرتی وابستگی کو ہی سب کچھ سمجھ لیا گیا اور کبھی ادب کو سماجی اور تہذیبی ذمہ داریوں سے یکسر عاری اور

Isolation میں پیدا کی جانے والی ہنرمندی کے نمونوں کی صورت میں قبول کر لیا گیا۔ اطمینان بخش بات یہ ہے کہ ہمارا ادبی عہد انتہا پسندی کے مراحل سے نکل کر اعتدال، تناسب اور میانہ روی کی شائستگی کی حدوں میں داخل ہو چکا ہے۔ اس لیے آج ہیئت اور مواد کی یک طرفہ بحث تقریباً لایعنی ہو کر رہ گئی ہے۔ پھر یہ ہے کہ آج ہی کیا بیسویں صدی کے وسط میں البیر کامیو اور ژاں پال سارتر جیسے Absurdity کو ایک اہم وجودی رویہ قرار دینے والے ادیبوں کے یہاں بھی، انسانی صورت حال سے نبرد آزما ہونے اور ادب کے ادبی تقاضوں کو پورا کرنے کی تلاش بہت واضح نظر آتی ہے۔ وہی کامیو 'متھ آف سیسیفس' میں انسان کو اس کے وجودی تجربے کے ہاتھوں لایعنیت کے اسطور اور استعارے میں پیش کرتا ہے، جب تخلیق کی آزادی کے ساتھ ادیب کی ذمہ داری کو ہم آہنگ کرنے کا ذکر کرتا ہے تو دونوں کے مابین توازن کی جستجو کو اپنا ماحصل قرار دیتا ہے۔ وہ وابستگی کے حوالے سے لکھتا ہے کہ:

> ''آج تخلیق کا مطلب ہے خطرناک طور پر تخلیق کرنا۔ ہر ادبی اظہار ایک عمل ہے اور یہ عمل ہمیں اپنے دور کے شدید جذبات کے روبرو لا کھڑا کرتا ہے، جو کسی کو معاف نہیں کرتا۔ یہ سوال ان تمام لوگوں کے لیے اہم ہے جو فن اور فنی اقدار کے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھتے۔ سوال صرف یہ جاننے کا ہے کہ احتسابی قوت کی موجودگی میں تخلیق کی حیرت انگیز آزادی کیوں کر ممکن ہے۔''

اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ ہر زمانے کی بلند پایہ شاعری میں ایک نوع کی اقدار پسندی کی نشان دہی ضرور کی جا سکتی ہے اور یہ اقدار پسندی ظالم کے خلاف مظلوم اور کہنہ روایات کے برخلاف نئے نظام یا شاعر کے خوش آئند خوابوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ شاعری میں آدرش پسندی کی زیریں لہریں ہی

اسے مستقبل کے قاری کے لیے بامعنی بناتی ہیں۔ اردو کی کلاسیکی شاعری میں مذہبی انتہاپسندی کے بجائے صوفیانہ رواداری، رسومیات کے برخلاف اعلیٰ انسانی اور اخلاقی اقدار اور ناپسندیدہ معاصر صورتحال کے مقابلے میں خواب وخیال کی دنیا میں پناہ لینے پر اصرار، دراصل آدرش پسندی کی ہی مختلف صورتیں ہیں۔ طنز وتعریض کے لہجے، ہجو ملیح کی نمائندگی کرنے والی اصناف اور اپنے عہد سے بے اطمینانی جیسے رویے، آدرش اور اقدار کی تلاش وجستجو کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتے۔ اردو میں ہجویہ شاعری یا شہر آشوب کی پوری روایت اقدار کی اسی کشمکش کی نمائندگی کرتی ہے۔ مگر اس حقیقت کو بجا طور پر محسوس کرنے کی ضرورت ہے کہ اردو کی ہجویہ شاعری اور شہر آشوب کے نمونوں میں ایسے مقامات کثرت سے آتے ہیں جب ہجو، ہجو کی سطح سے آگے نہیں بڑھ پاتی اور شہر آشوب بسا اوقات شاعر کی جھنجھلاہٹ اور نفسیاتی برہمی میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ شاعری کی دائمی قدر اور فن کاری کے نقطۂ ارتفاع تک رسائی حاصل نہیں کر پاتا۔ عموماً موزونیت اس کی سحر کاری کے طلسم کو ٹوٹنے نہیں دیتی، جس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ ہماری شعری روایت میں وزن وآہنگ کی ناگزیریت نے اکثر شاعری میں موجود برہمی برائے برہمی کو بھی واشگاف انداز میں بے نقاب نہیں ہونے دیا ہے۔

اگر ہم احتجاجی شاعری کی تاریخ مرتب کرنے بیٹھیں تو عین ممکن ہے کہ احتجاج، بغاوت یا انقلاب کی موضوعاتی کھتونی کرتے ہوئے اپنی تاریخ میں موجود رطب ویابس کو چھان پھٹک کر ان کی شاعرانہ اور ہنگامی قدر وقیمت کے مابین حد فاصل قائم نہ کر سکیں۔ مگر نظریاتی شدت اور نقطۂ نظر کی ادعائیت یا قطعیت کی انتہاپسندی کی فضا سے باہر آ کر شعری تقاضوں کو اگر ہم فراموش نہ کریں تو ہم احتجاجی اور انقلابی شاعری کے صرف ان نمونوں کو قابل اعتنا گردانیں گے جو انقلاب اور نقطۂ نظر کی سنجیدگی کیساتھ شعری اظہار کی تہہ داری کی حامل ہو۔ اگر معاصر تہذیبی صورت حال میں ادبی اور نظری مباحث ہماری بالغ نظری کی نمائندگی کرتے ہیں تو ہمیں نظریاتی اور فنی خیموں میں تقسیم

ہونے کے بجائے فکر کے ساتھ فن اور فن کے ساتھ فکر کے تقاضوں کے اعتدال و توازن پر اپنی توجہ مرکوز کرنی پڑے گی۔ نظریے کی قطعیت اکثر ہم سے معروضیت اور غیر جانب داری سے دست بردار ہونے کا مطالبہ کرتی ہے۔ غربت و افلاس کے مسائل ہوں یا اقتصادی پسماندگی کے، ان کے شاعرانہ اظہار کو معاشرتی اور تہذیبی اقدار پر اصرار کی صورت میں نمودار ہونا چاہیے، اسے ہماری نفسیاتی الجھن یا پیچیدگی نہیں بننا چاہیے۔ اگر اس نکتے کو نظر انداز کر دیا جائے کہ سماجی صورت حال انسانی رشتوں پر کیوں کر اثر انداز ہوتی ہے تو اس صورتحال کا شاعرانہ اظہار بھی اپنا بڑا دائرہ کار نہیں بنا پاتا۔ وارث علوی نے اپنے ایک مضمون میں انسانی رشتوں کے حوالے سے اکہری وابستگی کے مسئلے کو بڑے معنی خیز الفاظ کی شکل دی ہے:

> ’’کیا یہ حقیقت نہیں کہ انسان کی خوشی کا سر چشمہ محض اقتصادی آسائشیں نہیں بلکہ بھر پور انسانی تعلقات ہیں۔ ایک وہ ہیں جو سنجاب و سمور کی چادر پر بے قرار راتیں گزارتے ہیں، اور دوسرے وہ ہیں جو اپنی بانہوں میں کائنات کا غم لیے ایک دوسرے سے لپٹ کر پیار کی نیند سوتے ہیں۔‘‘

ہم نے اپنی معاشرتی صورتحال کے پس منظر میں، ماضی میں بعض ادبی رجحانات کے زیر اثر اقتصادی پسماندگی کو بجا طور پر غیر معمولی اہمیت دی ہے۔ اقتصادیات انسانی تہذیب کی ریڑھ کی ہڈی سہی، مگر اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کا احساس ضروری ہے کہ انسانی جدوجہد کی تاریخ طبقاتی نابرابری کے ساتھ ساتھ جبر و استحصال، غلامی، رنگ، نسل، زبان اور جنس کی بنیادوں پر قائم تفریق سے بھی عبارت رہی ہے۔ ہمیں مزاحمت اور احتجاج کے ان مختلف النوع منظر ناموں کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اگر حبشی فن کاروں کی بلیک پوئٹری یا بلیک لٹریچر کی تاریخ پر سرسری نگاہ بھی ڈالی جائے تو یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی کہ کالے ادیبوں کا تحریر کردہ ادب برہمی کی شدت اور

ردعمل کی نفرت کے باعث جب ادبی اور شعری حدوں کو پار کر جاتا ہے تو خود ان کے درمیان سے ہی بعض ادیب اٹھ کر اس کی ہنگامی نوعیت اور ادبی اقدار کے نظر انداز کیے جانے کی بحث شروع کر دیتے ہیں۔ واضح رہے کہ حقارت اور نسلی منافرت پر مبنی گوروں کی تفریق کا ردعمل نثر اور شاعری میں اکثر کالے ادیبوں کی مزاحمت اور احتجاج سے آگے بڑھ کر انتقام کا ادب بن جاتا ہے تاہم حبشی ادیبوں کا انتقامی ادب ہو یا احتجاجی ادب، وہ اس ادب سے بڑی حد تک مختلف ہو جاتا ہے جو انسان کو صرف اقتصادی تفریق کے آئینے میں دیکھتا اور دکھاتا ہے۔ بعض حبشی ادیبوں کا کہنا ہے کہ معاشی پسماندگی کے خلاف بغاوت پر اصرار انسان کو اندر سے بدلنے کے بجائے باہر سے بدلنے کی کوشش کے مترادف ہے۔ اس ضمن میں ایک ممتاز حبشی ناول نگار جیمس بالڈون، پورے آدمی کے ادب کی وکالت کرتا ہے۔ وہ احتجاج اور ردعمل کی شدت کا طرف دار ہونے کے باوجود اپنے معاصر رچرڈ رائٹ کے راست اظہار کو منفی جذبات کے عمل دخل پر محمول کرتا ہے اور منفی جذبات کو ادبی تخلیق کے لیے مہلک قرار دیتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ:

> ''آدمی کو اپنی زندگی میں ناانصافیوں کو کبھی معمولی چیز سمجھ کر قبول نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ اپنی پوری طاقت سے اس کے خلاف جنگ لڑنی چاہیے۔ لیکن جنگ کا آغاز بہر حال دل سے ہوتا ہے اور یہ ایک ادیب کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے کو نفرت اور مایوسی سے پاک رکھے۔ اس لیے کہ منفی جذبات کی شدت ادبی توازن کے نظام کو متزلزل کر دیتی ہے۔''

حبشی ادیبوں کے یہاں احتجاج اور باغیانہ ردعمل کی عام شدت کے برخلاف جذباتی توازن اور نفرت وحقارت کا جواب نفرت وحقارت سے نہ دینے کی تلقین دراصل بلند انسانی اقدار کی ادبی صورت گری پر اثر انداز ہوتی ہے۔ بالڈون نے ادبی تحقیق میں مایوسی سے بلند ہونے پر جو اصرار کیا ہے اس کا رشتہ حقیقت کی دریافت اور اس کے

بارے میں ادب لکھنے سے بھی ہے۔ وہ جولوکاچ نے حقیقت نگاری کے تین مدارج بتائے ہیں، ان میں اس نے عام حقیقت نگاری سے زیادہ اس انتقادی حقیقت نگاری کو اہمیت دی ہے جس میں موجود حقیقت کو تنقیدی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور غیر تسلی بخش قرار دیا جاتا ہے مگر وہ انتقادی حقیقت نگاری سے بھی زیادہ اہم اس حقیقت نگاری کو قرار دیتا ہے جس میں غیر اطمینان بخش حقیقت پر مایوسی کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ اس حقیقت کو بدلنے کی آرزو بھی حقیقت نگار کے مدعا کا حصہ ہوتی ہے۔ تاہم ادبی اظہار کے اس امتیازی رکھ رکھاؤ کا معاملہ پھر بھی بحث طلب رہتا ہے۔ اس لیے کہ انقلابی یا مزاحمتی جمالیات کی تشکیل میں اپنے ہر مرحلے میں حقیقت نگاری کی دیرپا اور ہمہ گیر قدر و قیمت کا وسیلہ بن پاتی ہے۔ اس ضمن میں سردار جعفری نے ایک جگہ احتجاج اور بغاوت کی شاعری کے لیے زبان اور لغت کی تشکیل نو کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ ''شاعری میں زبان اور لغت کی تبدیلی نثر کے مقابلے میں زیادہ دشوار ہے۔'' ان کا یہ بھی کہنا کہ موضوع کی وجہ سے اسٹائل اور جمالیاتی رویے تبدیل ہو جاتے ہیں۔ لیکن بات خواہ موضوع کو ترجیح دینے کی ہو یا جمالیاتی رویے کو ترجیح دینے کی، جو ادیب بھی مواد اور ہیئت کے توازن کی بات کرتا ہے، خواہ وہ ادب کی افادیت پر ہی کیوں نہ اصرار کرے، قابل قدر ہے۔ فیض احمد فیض نے اپنے ایک اہم مضمون 'شاعری کی قدریں' میں ادب کے جمالیاتی اور افادی کردار کو ہم آمیز کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تحریکی وابستگی بھی ان کے جمالیاتی احساس اور فنی نظم و ضبط کی بالادستی کے اعتراف سے انھیں روک نہیں پاتی۔ ادب کو تخلیق جمال کا عمل قرار دیتے ہوئے وہ اس میں افادیت کے پہلو کو اس طرح اہمیت دیتے ہیں:

> ''حسن کی تخلیق صرف جمالیاتی فعل نہیں افادی فعل بھی ہے۔ ہر وہ چیز جس سے ہماری زندگی میں حسن یا لطافت یا رنگینی پیدا ہو، جس کا حسن ہماری انسانیت میں اضافہ کرے، جس سے تزکیۂ نفس ہو، جو ہماری روح کو مترنم کرے، جس کی لو سے ہمارے

دماغ کو روشنی اور جلا حاصل ہو، صرف حسین ہی نہیں، مفید بھی ہے۔اس لیے جملہ غنائیہ ادب ہمارے لیے قابل قدر ہے۔''

ان فقروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ادبی قدر، افادی قدر کیسے بنتی ہے اور افادی قدروں میں فنی اور جمالیاتی پہلو پیدا کیے بغیر کیوں کر ادبی اور شعری اسالیب ہمہ گیری اور آفاقیت سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتے۔ اس سلسلے میں اگر خود فیض احمد فیض کی نظم کے چند اشعار یاد کر لیے جائیں تو شاید نامناسب اور بے محل بات نہ ہو۔ اس نظم میں ایک نئی شعریات ملتی ہے جس میں احتجاج اور مزاحمت نے ایسے جمالیاتی لہجے کی تشکیل کی ہے جو گہرے مضمرات اور دیر پا تاثرات کا بدل بن گیا ہے:

- آج کے نام اور آج کے غم کے نام/ آج کا غم، جو ہے زندگی کے بھرے گلستاں سے خفا/۔
- ان دکھی ماؤں کے نام/ رات میں جن کے بچے بلکتے ہیں اور/ نیند کی مار کھائے ہوئے بازوؤں سے سنبھلتے نہیں/ دکھ بتاتے نہیں/ منتوں زاریوں سے بہلتے نہیں/
- بیسواؤں کے نام/ کھڑکیوں اور گلیوں محلوں کے نام/ جن کی ناپاک خاشاک سے/ چاند راتوں کو آ آ کے کرتا ہے اکثر وضو/ جن کے سایوں میں کرتی ہے آہ و بکا/ آنچلوں کی حنا/ چوڑیوں کی کھنک/ کاکلوں کی مہک/ آرزو مند سینوں میں اپنے پسینے میں جلنے کی بو/
- طالب علموں کے نام/

وہ جو اصحاب طبل و علم کے دروں پر/ کتاب اور قلم کا/ تقاضا لیے، ہاتھ پھیلائے/ پہنچے، مگر لوٹ کر گھر نہ آئے/ وہ معصوم جو بھولپن میں وہاں/ اپنے ننھے چراغوں میں لو کی لگن لے کے پہنچے جہاں/ بٹ رہے تھے گھٹا ٹوپ بے انت راتوں کے سایے/ ......

ان مصرعوں میں شدید جذبات اور برہمی نے رکھ رکھاؤ اور شائستگیِ جذبات کا جو رنگ اختیار کیا ہے اس نے ردِعمل اور احتجاج کی شدت کو سبک، نرم رو، گوارہ اور ہشت پہل بنا دیا ہے۔ جو ہنگامی ہونے کے باوجود دائمی اقدار کی نمائندگی کرتا ہے اور جو ایسی شعریات کی تشکیل کرتا ہے جہاں تخلیقِ حسن، تزکیۂ نفس بن جاتی ہے۔ احتجاج کی اس شاعرانہ تشکیل سے اس بات کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شاعری میں تہہ داری اور ہمہ جہتی صرف رائج استعاراتی اسلوب کی مرہونِ منت نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ احتجاج کی لَے کسی بڑے فکری نظام سے مربوط ہو کر بھی بڑا سیاق و سباق اختیار کر لیتی ہے۔ اس طریق کار سے ایک ایسا اسلوب تخلیق کیا جا سکتا ہے جو فن کے لوازم کی پابندی کے ساتھ فکر کی دبازت اور ہمہ گیری کی بھی نمائندگی کرتا ہو۔ بڑا فکری نظام اپنے آپ میں اقداری نظام کا متبادل بن جاتا ہے۔ اس لیے بغاوت خواہ افکار کے خلاف ہو یا تفریقی طریق کار کے خلاف، اگر اس کی بنیاد منفی اقدار کے ردِعمل پر قائم ہے تو وہ اپنے دانش ورانہ حوالے خود پیدا کر لیتی ہے اور یہی فکری یا دانش ورانہ دبازت اس کی معنی خیزی کا جواز بن جاتی ہے۔ اردو میں اس نوع کی شاعری کی مثال اقبال کی احتجاجی شاعری کے نمائندہ نمونوں سے دی جا سکتی ہے۔ یوں تو اقبال کے یہاں علی العموم احتجاجی رویہ ملتا ہے لیکن ضربِ کلیم کی شاعری کا بڑا حصہ ان کے احتجاجی نکات کو ایک جگہ مجتمع کرتا ہے۔ لیکن اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اقبال جیسا استعاروں میں سوچنے والا شاعر بھی اپنے کمزور لمحوں میں اپنے احتجاج اور بغاوت کو شاعری میں بدلنے میں کامیاب نہیں ہو پاتا۔ اس طرح کی شاعری واعظوں اور خطیبوں کے زورِ بیان میں تو ضرور معاون ہوتی ہے مگر اقدار کے اس نظام کو جو اقبال کے بڑے فکری سیاق و سباق میں بہت معنی خیز ہے، یک رخی اور وقتی مفہوم کی حامل بنا دیتی ہے۔ اسی باعث ایسی سپاٹ اور یک رخی شاعری نہ تو ان کے نظامِ فکر کی سنجیدگی کا ساتھ دے پاتی ہے اور نہ ہنگامی صورتحال سے ارتفاع حاصل کر کے دیرپا ہونے کی صفت سے متصف ہو پاتی ہے۔ اس کے

برخلاف اقبال کی نمائندہ نظموں اور غزلوں میں ان کے احتجاج کی لَے دائمی قدر کی حیثیت بھی اختیار کرتی ہے اور ایک بڑے نظامِ فکر کا حصہ ہونے کے باعث دور رس اثرات کی حامل بھی بن جاتی ہے۔ ہنگامی ادب کا سب سے بڑا جواز یہ ہوتا ہے کہ اگر قافلہ سست گام ہے تو حدی کی آواز تیز کردی جائے اور اگر ذوقِ نغمہ کم ہوگیا ہے تو بانگ درا کا آہنگ بلند تر کر دیا جائے۔

حُدی را تیز تر می خواں چوں محمل را گراں بینی
جرس را تیز تر می زن چوں ذوقِ نغمہ کم یابی

مگر یہ رویے سماجی اصلاح یا معاشرتی جدلیات کے پس منظر میں کتنے ہی اہم کیوں نہ ہوں شاعری کے پُراسرار تخلیقی عمل کا حصہ اسی وقت بن پاتے ہیں جب اس کی تہہ داری اسے بعد کے زمانے کے لیے بھی معنی خیز بنائے رکھے۔

احتجاج اور شاعری کے رشتے جس تخلیقی سریّت پر مبنی ہوتے ہیں وہی سریت شاعری میں احتجاج کو دور رس اثرات کا حامل بناتی ہے اور اسی سریت کی بدولت شاعری، صحافت، خطابت اور بلند آہنگ نعروں سے مختلف ہی نہیں ممتاز بھی ہو جاتی ہے۔ سماجی نابرابری کا معاملہ ہو، جبر و استحصال کے خلاف علم بغاوت اٹھانے کی بات ہو یا نسلی یا جنسی تفریق پر قائم معاشرتی بے اعتدالی کا مسئلہ ہو، دنیا کے ایک عالمی گاؤں میں سمٹ آنے کے بعد تفریق کے ہر معاملے کو نشان زد کرنے اور چھوٹی چھوٹی سماجی اکائیوں پر توجہ صرف کرنے کی گنجائش ادب کے 'مابعد جدید' رویوں نے بخوبی پیدا کردی ہے۔ اس لیے نسلی، لسانی، علاقائی اور مذہبی اکائیوں سے لے کر تانیثیت تک انحرافی اور مزاحمتی ادب کو بالعموم اور مزاحمتی شاعری کو بالخصوص ایک نیا سیاق و سباق مل گیا ہے۔ یہ سیاق و سباق ایک مرحلے پر ثقافتی اور تہذیبی اقدار سے جا ملتا ہے اور اس طرح یہ ایک بڑے اقداری اور ثقافتی دائرۂ کار کی تشکیل کرتا ہے۔ اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ مابعد جدیدیت نے احتجاج اور مزاحمت کے مفہوم میں مزید وسعت اور معنی خیزی پیدا کردی ہے۔

رابندر ناتھ ٹیگور نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''ادب حق کے ساتھ جمال کی تلاش کا نام ہے۔'' یہ جمالیاتی پہلو ادب کو دیرپا بناتا ہے اور حق یا صداقت کی تلاش اس میں فکری عمق پیدا کرتی ہے۔ بس اس بات کی احتیاط لازم ہے کہ مخصوص ہنگامی حالات کے گزرنے کے بعد مزاحمتی شاعری اپنی معنویت اور اطلاق سے محروم نہ ہو جائے۔ تاہم یہ سوال کہ شاعری میں دیرپا ہونے کا عنصر اس کی سریت سے پیدا ہو، اقدار کے نظام کی تخلیق سے ہو یا دوسرے ان گنت شعری وسائل میں سے کسی وسیلے کے استعمال سے، اس کا انحصار شاعر کی اپنی توفیق اور شعری طریق کار پر ہے۔ ورنہ حقیقت یہی ہے کہ شعر و ادب کی تخلیق بہ ذات خود ایک مزاحمتی عمل ہے۔ اس لیے مزاحمت کا نام لیے بغیر بھی ہر زمانے کے شعر و ادب میں اس کی کارفرمائی دیکھی جا سکتی ہے۔ اسی لیے محمد حسن عسکری جیسے ہیئت پرست نقاد تک کو ادب کے انقلابی کردار کا یہ اعتراف دبی زبان سے ہی سہی مگر اس طرح کرنا پڑا:

> ''بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت کا احساس سب سے پہلے ادب ہی دلاتا ہے۔ اپنے آپ کو انقلابی کہے بغیر ادب ہر بڑے اور بنیادی انقلاب کا نقیب ہوتا ہے۔ چوں کہ ادب ایک آلہ ہے نئے توازن کی جستجو کا، اس لیے تبدیلیوں کی حمایت ادب کے لیے ناگزیر ہے۔''

ن.م.راشد

(۱) دریچے کے قریب

جاگ اے شمع شبستانِ وصال
محفلِ خواب کے اس فرشِ طربناک سے جاگ
لذتِ شب سے ترا جسم ابھی چور سہی
آ مری جان، مرے پاس دریچے کے قریب
دیکھ کس پیار سے انوارِ سحر چومتے ہیں
مسجدِ شہر کے میناروں کو
جن کی رفعت سے مجھے
اپنی برسوں کی تمنا کا خیال آتا ہے

سیمگوں ہاتھوں سے اے جان ذرا
کھول مے رنگ جنوں خیز آنکھیں
اسی مینار کو دیکھ
صبح کے نور سے شاداب سہی
اسی مینار کے سائے تلے کچھ یاد بھی ہے

اپنے بے کار خدا کی مانند
اونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں
ایک افلاس کا مارا ہوا ملائے حزیں
ایک عفریت ——— اداس
تین سو سال کی ذلت کا نشاں
ایسی ذلت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی

دیکھ بازار میں لوگوں کا ہجوم
بے پناہ سیل کی مانند رواں!
جیسے جنات بیابانوں میں
مشعلیں لے کے سرِ شام نکل آتے ہیں
ان میں ہر شخص کے سینے کے کسی گوشے میں
ایک دلہن سی بنی بیٹھی ہے
ٹمٹماتی ہوئی ننھی سی خودی کی قندیل
لیکن اتنی بھی توانائی نہیں
بڑھ کے ان میں سے کوئی شعلۂ جوالہ بنے
ان میں مفلس بھی ہیں، بیمار بھی ہیں
زیرِ افلاک مگر ظلم سہے جاتے ہیں

ایک بوڑھا ساتھکا ماندہ سار ہوار ہوں میں!
بھوک کا شاہ سوار
سخت گیر اور تنومند بھی ہے
میں بھی اس شہر کے لوگوں کی طرح
ہر شب عیش گذر جانے پر
بہر جمع خس وخاشاک نکل جاتا ہوں
چرخ گرداں ہے جہاں
شام کو پھر اسی کاشانے میں لوٹ آتا ہوں
بے بسی میری ذرا دیکھ کہ میں
مسجد شہر کے میناروں کو
اس دریچے میں سے پھر جھانکتا ہوں
جب انہیں عالم رخصت میں شفق چومتی ہے

○

(۲) زنجیر

گوشۂ زنجیر میں
اک نئی جنبش ہویدا ہو چلی
سنگ خارا ہی سہی، خار مغیلاں ہی سہی
دشمن جاں، دشمن جاں ہی سہی/ دوست سے دست و گریباں ہی سہی
یہ بھی تو شبنم نہیں
یہ بھی تو مخمل نہیں، دیبا نہیں، ریشم نہیں

ہر جگہ پھر سینۂ نخچیر میں
اک نیا ارماں، نئی امید پیدا ہو چلی
حجلۂ سیمیں سے تو بھی پیلۂ ریشم نکل
وہ حسیں اور دور افتادہ فرنگی عورتیں
تو نے جن کے حسن روز افزوں کی زینت کے لیے
سالہا بے دست و پا ہو کر بنے ہیں تار ہائے سیم و زر
ان کے مردوں کے لیے بھی آج اک سنگین جال

ہو سکے تو اپنے پیکر سے نکال

سکر ہے دنبالۂ زنجیر میں
اک نئی جنبش، نئی لرزش ہویدا ہو چلی
کوہساروں، ریگزاروں سے صدا آنے لگی
ظلم پروردہ غلاموں بھاگ جاؤ
پردۂ شبگیر میں اپنے سلاسل توڑ کر
چار سو چھائے ہوئے ظلمات کو اب چیر جاؤ
اور اس ہنگام باد آورد کو
حیلۂ شب خوں بناؤ

○

(۳) من وسلویٰ

''خدائے برتر
یہ داریوش بزرگ کی سرزمیں
یہ نوشیروان عادل کی دادگاہیں
تصوف و حکمت و ادب کے نگارخانے
یہ کیوں سیہ پوش دشمنوں کے وجود سے
آج پھر ابلتے ہوئے سے ناسور بن رہے ہیں؟''

ہم اس کے مجرم نہیں ہیں، جان عجم نہیں ہیں
وہ پہلا انگریز
جس نے ہندوستاں کے ساحل پر/ لا کے رکھی تھی جنس سوداگری
یہ اس کا گناہ ہے/ جو ترے وطن کی
زمین گل پوش کو
ہم اپنے سیاہ قدموں سے روندتے ہیں

یہ شہر اپنا وطن نہیں ہے/ مگر فرنگی کی رہزنی نے
اسی سے ناچار ہم کو وابستہ کر دیا ہے
ہم اس کی تہذیب کی بلندی کی چھپکلی بن کے رہ گئے ہیں

وہ راہزن جو یہ سوچتا ہے
کہ ایشیا ہے کوئی عقیم و امیر بیوہ
جو اپنی دولت کی بے پناہی سے مبتلا اک فشار میں ہے
اور اس کا آغوش آرزومند وامرے انتظار میں ہے
اور ایشیائی
قدیم خواجہ سراؤں کی اک نژاد کاہل
اجل کی راہوں پہ تیز گامی سے جا رہے ہیں
مگر یہ ہندی/ گرسنہ و پابرہنہ ہندی
جو سالکِ راہ ہیں/ مگر راہ و رسم منزل سے بے خبر ہیں
گھروں کو ویران کر کے/ لاکھوں صعوبتیں سہہ کے
اور اپنا لہو بہا کر/ اگر کبھی سوچتے ہیں کچھ تو یہی
کہ شاید انہی کے بازو/ نجات دلوا سکیں گے مشرق کو
غیر کے بے پناہ بکھرے ہوئے ستم سے/ یہ سوچتے ہیں
یہ حادثہ ہی کہ جس نے پھینکا ہے/ لا کے ان کو ترے وطن میں
وہ آنچ بن جائے/ جس سے پھنک جائے

وہ جراثیم کا اکھاڑہ/ جہاں سے ہر بار جنگ کی بوئے تند اٹھتی ہے
اور دنیا میں پھیلتی ہے

میں جانتا ہوں/ مرے بہت سے رفیق
اپنی اداس، بے کار زندگی کے/ دراز و تاریک فاصلوں میں
کبھی کبھی بھیڑیوں کی مانند/ آ نکلتے ہیں رہ گذاروں پہ
جستجو میں کسی کے دو ''ساق صندلیں'' کی/ کبھی دریچوں کی اوٹ میں
ناتواں پتنگوں کی پھڑ پھڑاہٹ پہ/ ہوش سے بے نیاز ہو کر وہ ٹوٹتے ہیں
وہ دستِ سائل/ جو سامنے ان کے پھیلتا ہے/ اس آرزو میں
کہ ان کی بخشش سے/ پارۂ نان، من و سلویٰ کا روپ بھر لے
وہی کبھی اپنی نازکی سے/ وہ رہ سمجھتا ہے
جس کی منزل پہ شوق کی تشنگی نہیں ہے/ تو ان مناظر کو دیکھتی ہے
تو سوچتی ہے
——— یہ سنگدل اپنی بزدلی سے
فرنگیوں کی محبت ناروا کی زنجیر میں بندھے ہیں
انہی کے دم سے یہ شہر ابلتا ہوا سا ناسور بن رہا ہے
محبت ناروا نہیں ہے/ بس ایک زنجیر
ایک ہی آہنی کمند عظیم/ پھیلی ہوئی ہے
مشرق کے اک کنارے سے دوسرے تک/ مرے وطن سے ترے وطن تک

بس ایک ہی عنکبوت کا جال ہے کہ جس میں
ہم ایشیائی اسیر ہو کر تڑپ رہے ہیں
مغول کی صبح خوں فشاں سے/ فرنگ کی شام جاں ستاں تک
تڑپ رہے ہیں/ بس ایک ہی درد لا دوا میں
اور اپنے آلام جاں گزا کے/ اس اشتراک گراں بہا نے بھی
ہم کو اک دوسرے سے اب تک/ قریب ہونے نہیں دیا ہے

○

(۴) اجنبی عورت

ایشیا کے دور افتادہ شبستانوں میں بھی
میرے خوابوں کا کوئی روماں نہیں
کاش اک دیوار ظلم
میرے ان کے درمیاں حائل نہ ہو
یہ عمارات قدیم
یہ خیاباں، یہ چمن، یہ لالہ زار
چاندنی میں نوحہ خواں
اجنبی کے دست غارت گر سے ہیں
زندگی کے ان نہاں خانوں میں بھی
میرے خوابوں کا کوئی روماں نہیں

کاش اک 'دیوار رنگ'
میرے ان کے درمیاں حائل نہ ہو
یہ سیہ پیکر برہنہ راہرو

یہ گھروں میں خوبصورت عورتوں کا زہر خند
یہ گذرگاہوں پہ دیو آسا جواں
جن کی آنکھوں میں گرسنہ آرزوؤں کی لپک
مشتعل، بے باک مزدوروں کا سیلاب عظیم
ارضِ مشرق، ایک مبہم خوف سے لرزاں ہوں میں
آج ہم کو جن تمناؤں کی حرمت کے سبب
دشمنوں کا سامنا مغرب کے میدانوں میں ہے
ان کا مشرق میں نشاں تک بھی نہیں!

○

اخترالایمان

(۱) آثار قدیمہ

برتن، سکے، مہریں
بے نام خداؤں کے بت ٹوٹے پھوٹے
مٹی کے ڈھیروں میں پوشیدہ چکی چولھے
کنداوزار زمینیں جن سے کھودی جاتی ہوں گی
کچھ ہتھیار جنہیں استعمال کیا کرتے ہوں گے مہلک حیوانوں پر
کیا بس اتنا ہی ورثہ ہے میرا
انسان یہاں سے جب آگے بڑھتا ہے کیا مر جاتا ہے

شاہسواروں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے اٹھنے والی گرد تو کب کی بیٹھ گئی
کلچر کا پرچم لیکر چلنے والے شاعر اور مورخ اپنی اپنی گور میں چپ لیٹے ہیں
ریشم اور کتاں، مہ پاروں کی آرائش کے ساماں کی اب چاہ نہیں کچھ
سوداگر اپنے اپنے ملکوں کی یہ مصنوعات نہیں لے جاتے
مہلک انساں کش ہتھیاروں کا سودا کرتے ہیں
برق صفت طیاروں کی ایجاد بھی کام نہیں آئی کچھ

دلی سے لاہور کے بازاروں کا فاصلہ پہلے سے کچھ اور بڑھا ہے
عشق کی سب راہیں ویران ہوئیں اب ہر جا خاک اڑتی ہے
جابر شاہوں کے تابوت ان کی قبروں میں گل کر خاک ہو گئے سب
لیکن ان کی روحیں دوسرے جسموں میں در آئی ہیں
کوچہ کوچہ قاتل مشعل لے کر گھوم رہے ہیں
گیسوں اور مہلک ہتھیاروں کی فیکٹریاں عاشق کی آنکھوں کی صورت جاگ رہی ہیں
خوش قامت بانکے چھیلا، سب ایک مجسم شہوت بنتے جاتے ہیں
اور حسینوں کے اندام بھی فضلے کے ڈبے کی صورت کھلے ہوئے ہیں
ہم کو زندہ رہنا ہے، جب تک موت نہیں آتی اک زہر پئے جانا ہے
آؤ چلو کتوں کا دربار سجائیں، کوؤں کی بارات نکالیں

○

(۲) میرا دوست - ابوالہول

دھواں دھار تقریر ابھی جس نے کی تھی وہ آدمی ہے
جو لفظوں کے پل باندھتا ہے
ابھرتے ہوئے نوجوانوں کو وعدوں کی افیون دے کر
اسی پل پہ لاتا ہے اور غرق کر کے
پلٹ جاتا ہے حسب دستور آرام گہہ کو

یہ دنیا تو ان شعلہ سامان لوگوں نے آپس میں تقسیم کر لی
جو ہتھیار کی شکل میں رنج و غم ڈھالتے ہیں
یا گولہ بارود کے کارخانوں کے مالک ہیں
یا پھر ثنا خواں ہیں ان کے
ہمارے لئے صرف نعرے بچے ہیں
صنعتی دور کے کج کلاہوں کی داد و دہش روح پرور ہو یا جان لیوا
مگر زندہ باد، آفریں، مرحبا کے سوا کچھ نہیں پاس اپنے
یہ سب جانتا ہے ہماری شجاعت کی پرواز کیا ہے

ہماری جواں مردی اک صوبہ جاتی تعصب سے
یا فرقہ واری فسادات سے آگے کچھ بھی نہیں ہے
فتوحات اسکندری ہم نے تختی پہ لکھ کے مٹادی ہے کب کی
ہمارے بہادر زمیں کے تلے سو رہے ہیں
عجائب گھروں میں لٹکتی ہے تلوار ان کی
اور ان کے زریں لبادوں کو گھن کھا گیا ہے
زرہ بکتروں پر کلونس آ گئی ہے
یہ سب جانتا ہے ہماری تگ و تاز کیا ہے
ہمارے شکم گر ہمارے سروں پر نہ ہوتے
اور چہروں پہ اعضائے جنسی
تو ہم اچھے انسان بنتے
ہمارے گھروں کے کم و بیش سب عقبی دروازے پیہم کھلے ہیں
ہمارے لہو میں ہرے، لال، پیلے بہت سارے پرچم کھلے ہیں
کہیں سے مگر حق کی آواز آتی نہیں ہے
ہماری زباں دل کی ساتھی نہیں ہے
ہمارے لیے کھوکھلا لفظ جمہوریت ہے تقاریر ہے لیڈروں کی
ہمارے لیے روزناموں کے صفحات ہیں، اشتہارات ہیں نیم جنسی
ہمارے لیے دیوتاؤں کے بت ہیں، خدا کے فرامین ہیں اور عقبیٰ
جو بدرنگ ہے حال کی طرح اور کورے لٹھے کی بو سے بھری ہے

ہمارے لیے صرف روٹی کی جد و جہد
عورتوں کے برہنہ بدن کی تمنا سے آگے کہیں کچھ نہیں ہے
ہماری رگوں میں جو تیزاب ہے اس کی شدت کبھی کم نہ ہوگی

○

(۳) میری آواز

ملائکہ مری آواز سن رہے ہو تم؟
سنی ہے پہلے بھی تم نے ضرور یہ آواز
بہت لطیف تھی، شیریں تھی اس میں نرمی تھی
شگفتگی تھی، یقیں تھا، بلند حوصلگی تھی
کھنک تھی اس میں توانائی اور گرمی تھی
یہ آج خشک ہے بے جان ہے اور بے رس ہے
تھکی تھکی سی ہے، مجروح اور بے بس ہے

ملائکہ مری آواز سن رہے ہو تم؟
خدا نے چھین لیں بیساکھیاں بھی انساں سے
پیمبر اب نہیں آتے زمین بانجھ ہوئی
تمام سلسلے تہذیب و ضبط کے جو تھے
وہ سارے ٹوٹ گئے زندگی تڑپتی ہے
اک ایسے درد سے جو دردِ زہ نہیں شاید

ملائکہ دل ایذا طلب نہیں ہارا
مگر مشین کی معیاد ہے کبھی نہ کبھی
اک ایسا وقت تو آتا ہے جب نہ ہو یارا
کسی بھی بات کا درباز ہی نہ ہو کوئی
غنیم وقت بھی ہے سامری صفت گویا
تمام کہنہ مسائل ہیں جوں کے توں پھر بھی
ہر ایک شخص ہے مصروف یاوہ گوئی میں
اندھیر گردی کو کہنے لگے ہیں آزادی

میں رونا چاہتا ہوں کس پہ روؤں لیکن میں
اس ایک بات پہ ظالم ہے سرخرو، مظلوم
جواب مانگنے جائے تو اور رسوا ہو
فساد اور بڑھے، ہو اگر بنا معلوم
اس ایک بات پہ مقتل بنا ہے شہر کا شہر
مگر بیان سے بڑھ کر کوئی سبیل نہیں
کسی کے سامنے معصوم کی اپیل نہیں
سخنوروں پہ روؤں جن کے سامنے اس وقت
تمام مسئلے بے جان ہیں سوا اس کے
جو چائے خانوں سے چھوٹیں تو بھوکی آنکھوں سے

زنان شہر کے پستان ناپیں یا اپنے
اکیلے بیٹھے ہوئے زیرناف بال گنیں

ملائکہ مری آواز سن رہے ہو تم؟
سنی تھی پہلے بھی تم نے ضرور یہ آواز
مگر وہ پہلی سی معصومیت نہیں ہے آج
تمام کرب زمانے کا بھرگیا اس میں
جو زہر زیست میں ہے سب اتر گیا اس میں

○

(۴) کالے سفید پروں والا پرندہ اور میری ایک شام

جب دن ڈھل جاتا ہے سورج دھرتی کی اوٹ میں ہو جاتا ہے
اور بھڑوں کی چھتے جیسی بھن بھن
بازاروں کی گرمی، افراتفری
موٹر، بس، برقی ریلوں کا ہنگامہ تھم جاتا ہے
چائے خانوں، ناچ گھروں سے کم سن لڑکے
اپنے ہم سن معشوقوں کو
جن کی جنسی خواہش وقت سے پہلے جاگ اٹھی ہے
لے کر جا چکتے ہیں
بڑھتی، پھیلتی، اونچی ہمالہ جیسی تعمیروں پر خاموشی چھا جاتی ہے
تھیٹر، تفریح گاہوں میں تالے پڑ جاتے ہیں
اور بظاہر دنیا سو جاتی ہے
میں اپنے کمرے میں بیٹھا سوچا کرتا ہوں
کتوں کی دم ٹیڑھی کیوں ہوتی ہے

یہ چتکبری دنیا جس کا کوئی بھی کردار نہیں ہے
کوئی فلسفہ، کوئی پائندہ اقدار نہیں، معیار نہیں ہے
اس پر اہل دانش، ودوان، فلسفی
موٹی موٹی ادق کتابیں کیوں لکھا کرتے ہیں
فرقت کی ماں نے شوہر کے مرنے پر کتنا کہرام مچایا تھا
لیکن عدّت کے دن پورے ہونے سے اک ہفتہ پہلے
نیلم کے ماموں کے ساتھ بدایوں جا پہنچی تھی
بی بی کی صحنک، کونڈے، فاتحہ خوانی
جنگ صفیں، جمل اور بدر کے قصوں
سیرت نبوی، ترک دنیا اور مولوی صاحب کے حلوے مانڈے میں کیا رشتہ ہے
دن تو اڑ جاتے ہیں
یہ سب کالے پر والے بگلے ہیں
جو ہنستے، کھیلتے لمحوں کو
اپنے پنکھوں میں موند کے آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں
راحت جیسے خواب ہے ایسے انسانوں کا
جن کی امیدوں کے دامن میں پیوند لگے ہیں
جامہ ایک طرف سیتے ہیں دوسری جانب پھٹ جاتا ہے
یہ دنیا لمحہ جیتی ہے
مریم اب کپڑے سیتی ہے

آنکھوں کی بینائی ساتھ نہیں دیتی اب

اور غضنفر

جو رومال میں لڈو باندھ کے اس کے گھر میں پھینکا کرتا تھا

اور اس کی آنکھوں کی توصیف میں غزلیں لکھوا کر لایا کرتا تھا

اس نے کہیں اور شادی کر لی ہے

اب اپنی لکڑی کی ٹال پہ بیٹھا

اپنی کج رائی اور جوانی کے قصے دہرایا کرتا ہے

ٹال سے اٹھ کر جب گھر میں آتا ہے

بیٹی پر قدغن رکھتا ہے

نئے زمانے کی اولاد اب ویسی نہیں رہ گئی

بدکاری بڑھتی جاتی ہے

جو دن بیت گئے، کتنے اچھے تھے!

برگد کے نیچے بیٹھو یا سولی چڑھ جاؤ

بھینسے لڑنے سے باز نہیں آئیں گے

موت سے ہم نے ایک تعاون کر رکھا ہے

سڑکوں پر سے ہر لمحہ اک میت جاتی ہے

پس منظر میں کیا ہوتا ہے نظر کہاں جاتی ہے

سامنے جو کچھ ہے رنگوں، آوازوں چہروں کا میلا ہے

گرگل اڑا کر وہ پلکھن پر جا بیٹھی
پیپل میں توتے نے بچے دے رکھے ہیں
گلدم جو پکڑی تھی بے چاری کل مر گئی
نجمہ کے بیلے میں کتنی کلیاں آئی ہیں
پھولوں کی خوشبو سے کیا کیا یاد آتا ہے

یہ جب کا قصہ ہے سڑکوں پہ نئی نئی بجلی آئی تھی
اور مجھے سینے میں دل ہونے کا احساس ہوا تھا
عید کے دن ہم نے لٹھے کی شلواریں سلوائی تھیں
اور سویوں کا زردہ ہمسائے میں بھجوایا تھا
سب نیچے بیٹھک میں بیٹھے تھے
میں اوپر کے کمرے میں بیٹھا
کھڑکی سے زینت کے گھر میں پھولوں کے گچھے پھینک رہا تھا
کل زینت کا گھر نیلام ہو رہا ہے
سرکاری تحویل میں تھا اک مدت سے

شاید پت جھڑ کا موسم آ پہونچا
پتوں کے گرنے کی آواز مسلسل آتی ہے
چیچک کا ٹیکہ بیماری کو روکے رکھتا ہے

ضبط تولید، اسقاط وغیرہ
انسانی آبادی کو بڑھنے سے روکیں گے
بندر نے جب سے دو ٹانگوں پر چلنا سیکھا
اس کے ذہن نے حرکت میں آنا سیکھا
پتوں کی آواز مسلسل آتی ہے
سڑکوں پر روز نئے چہرے ملتے ہیں
موت سے ہم نے ایک تعاون کر رکھا ہے
پس منظر میں نظر کہاں جاتی ہے
پھولوں کی خوشبو سے کیا کیا یاد آتا ہے
چوک میں جس دن پھول پڑے سڑتے تھے
خونی دروازے پر شہزادوں کی پھانسی کا اعلان ہوا تھا
یہ دنیا لمحہ جیتی ہے/ دل کی گلیاں ویسی ہی آباد شاد ہیں سب
دن تو کالے پروالے بگلے ہیں/ جو سب لمحوں کو
اپنے پنکھوں میں موند کر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں
چاروں جانب رنگ رنگ کے جھنڈے اڑتے ہیں
سب کی جیبوں میں انسانوں کے دکھ درد کا درماں
خوشیوں کا نسخہ بندھا پڑا ہے
لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے/ جب نسخہ کھلتا ہے
۱۸۵۷ء جاتا ہے/ ۱۹۴۷ء آجاتا ہے

(۵) اپاہج گاڑی کا آدمی

کچھ ایسے ہیں جو زندگی کو مہ و سال سے ناپتے ہیں
گوشت سے، ساگ سے، دال سے ناپتے ہیں
خط و خال سے، گیسوؤں کی مہک، چال سے ناپتے ہیں
صعوبت سے جنجال سے ناپتے ہیں
یا اپنے اعمال سے ناپتے ہیں

یہ لمحہ جو گزرا مرے خون کی اس میں سرخی ملی ہے؟
مرے آنسوؤں کا نمک اس کی لذت میں شامل ہوا ہے؟
پسینے سے گرداب ساحل ہوا ہے؟
یہ لا کا سفر لا رہے گا کہ کچھ اس کا حاصل ہوا ہے
کہ جیسی تھی برسوں سے ویسی ہی تشنہ دلی ہے؟

میں کب سے زمیں پر زمیں کی طرح چل رہا ہوں
یہ دیوانہ اندھا سفر کب کہاں جا کے چھوڑے گا مجھ کو

میں اس زندگی کی بہت سی بہاریں غذا کی طرح کھا چکا ہوں
پہن اوڑھ کر پیرہن کی طرح پھاڑ دی ہیں

میں ریشم کا کیڑا ہوں کویے میں چھپ جاتا ہوں ڈر کے مارے
اسی کویے کو کھاتا رہتا ہوں اور کاٹ کر اس کو آتا ہوں باہر
اور اپنے جینے کا مقصد، سبب جاننا چاہتا ہوں
مرا دل خدا کی رضا ڈھونڈتا پھر رہا ہے
مرا جسم لذات کی جستجو میں لگا ہے
گذرگاہِ شام وسحر پر کہیں ایک دن میں اگا تھا
نباتات کی طرح جیتا ہوں اس کارگاہِ جہاں میں
نہ احسان، ایمان، ایقان کوئی
نہ دنیا میں شامل نہ خود اپنی پہچان کوئی
گنہ اور جہنم، ثواب اور جنت
یہ کیوں ہے بے مزد کچھ بھی نہیں مل سکا ہے
نہ کل مل سکے گا
اساطیر، فرماں رواؤں کے احکام اور صوفیا کی کرامت کے قصے
پیمبر کی دلسوزیوں کے مظاہر
قلم بند ہیں سب
انہیں ہم نے تعویذ کی طرح اپنے گلوں میں حمائل کیا ہے

انہیں ہم نے تہہ خانوں کی کوٹھری میں مقفل کیا ہے
جہاں لڑکھڑاتے ہیں ان کی مدد لے کے چلتے ہیں آگے
مگر راستوں کا تعین نہیں ہے

میں بکھرا ہوا آدمی ہوں
مری ذہنی بیماریوں کا سبب یہ زمیں ہے
میں اس دن سے ڈرتا ہوں جب برف ساری پگھل کر
اسے غرق کر دے
نئے آسمانی حوادث
صفر میں بدل دیں
یا آدمی اپنے اعمال سے خود
اسے اک کہانی بنا دے
زمیں شورہ پشتوں کی آماجگہ بن گئی ہے

خدا ایک ہے یوں تو واوین میں صاف لکھا ہوا ہے
مگر زیر واوین بھی چھوٹی چھوٹی بہت تختیاں ہیں
جلی حرف جن کے بہت امتوں کا پتہ دے رہے ہیں
جو یہ تختیاں اپنی گردن میں لٹکائے
زنار پہنے ہوئے کوئی تسبیح تھامے

اپنی گردِ سفر کے دھندلکوں میں لپٹے چلے جا رہے ہیں
زیتون کی شاخ، تلسی کے پتے
ہوا میں اڑے جا رہے ہیں
چیونٹوں کی قطاریں قرن در قرن
مختلف پیچ در پیچ راہوں سے گزری چلی جا رہی ہیں
سیکڑوں سر کٹے دھڑ بہت راستوں پر پڑے ہیں
ہون ہو رہے ہیں/ یگیہ کے منتروں کی صدا
آگ میں جلنے والی سامگری کی بہت تیز بو
ہر طرف پھیل کر بس گئی ہے ہوا میں
اور وا وین کی قید میں جو خدا ہے
لا مکاں سے/ جو ہوتا ہے ہوتا رہے گا
بیٹھا چپ چاپ سب دیکھتا ہے

ہم بھی کیوں نہ خدا کی طرح یوں ہی چپ سادھ لیں
پیڑ پودوں کی مانند جلتے رہیں/ ذبح ہوتے رہیں
وہ، دعائیں جو بارود کی بو میں بس کر
بھٹکتی ہوئی زیرِ عرش بریں پھر رہی ہیں/ انھیں بھول جائیں
زندگی کو خدا کی عطا جان کر ذہن ماؤف کر لیں
یا وہ گوئی میں یا ذہنی ہذیان میں خود کو مصروف کر لیں

ان میں مل جائیں جو زندگی کو
گوشت سے، ساگ سے، دال سے ناپتے ہیں
مہ و سال سے ناپتے ہیں
اپنا ہی خون پینے لگے ہیں
چاک دامانیاں غم سے سینے لگے ہیں

○

علی سردار جعفری

(۱) نوالا

ماں ہے ریشم کے کارخانے میں
باپ مصروف سوتی مل میں ہے
کوکھ سے ماں کی جب سے نکلا ہے
بچہ کھولی کے کالے دل میں ہے
جب یہاں سے نکل کے جائے گا
کارخانوں کے کام آئے گا
اپنے مجبور پیٹ کی خاطر
بھوک سرمائے کی بڑھائے گا
ہاتھ سونے کے پھول اگلیں گے
جسم چاندی کے دھن لٹائے گا
کھڑکیاں ہوں گی بینک کی روشن
خون اس کا دیئے جلائے گا
یہ جو ننھا ہے بھولا بھالا ہے
صرف سرمائے کا نوالا ہے
پوچھتی ہے یہ اس کی خاموشی
کوئی مجھ کو بچانے والا ہے

○

(۲) دعا

(ویت نام سے کشمیر تک خون آلودہ افق کے نام)

پھر چلا جنگ کا دیوتا / سرخ شعلوں کے خنجر کو تانے ہوئے
خون کی پیاس سے / گوشت کی بھوک سے
چیختا اور چنگھاڑتا / آسمانوں پہ عفریت کی طرح اڑتا ہوا
موت کی طرح دھرتی پہ چلتا ہوا

حسن کی خیر، خیر بچوں کی، معصومیت کی / فصلیں سہمی ہوئی
کھیت گھبرائے گھبرائے سے / جو فضائیں نئی کونپلوں کی مہک سے معطر تھیں وہ
گندی بارود کی بو سے سرشار ہیں / خوں کے چھینٹے ہیں شبنم کے پیراہنوں پر
مندروں، مسجدوں اور کلیساؤں کے دامنوں پر / اس کا آغاز سب کچھ
انجام کچھ بھی نہیں
حاصل قتل و غارت ہے کیا / چند اجڑتے ہوئے شہر جھلسے ہوئے راستے
سرنگوں بیوگی / اشک آلودہ زخم خوردہ یتیمی

کوئی گوتم نہیں جس کی شفقت / دل کے زخموں پہ رکھ دے
اپنے غمگیں تبسم کی درد آشنا چاندنی / کوئی گاندھی نہیں
آج جس کی شہادت سپر بن کے ہر وار کو روک لے
کوئی نہرو نہیں / جس کا دامن پکڑ کر یہ پوچھیں یہ کیا ہو رہا ہے

گیت کے دل میں خنجر ہیں الفاظ ہیں سر بریدہ
اپنے قبضے میں ایک بے بسی کے سوا کچھ نہیں / نالے بیکار فریاد بے سود ہے
آؤ مل کر محبت کو آواز دیں / نیکیوں کو پکاریں

○

مخدوم محی الدین

(۱) چاند تاروں کا بن

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن/ رات بھر جھلملاتی رہی شمع صبح وطن
رات بھر جگمگا تا رہا چاند تاروں کا بن/ تشنگی تھی مگر
تشنگی میں بھی سرشار تھے/ پیاسی آنکھوں کے خالی کٹورے لئے
منتظر مرد و زن/ مستیاں ختم، مدہوشیاں ختم تھیں، ختم تھا بانکپن
رات کے جگمگاتے دہکتے بدن

صبح دم ایک دیوارِ غم بن گئے/ خارزار الم بن گئے
رات کی شہ رگوں [کا اچھلتا لہو/ جوئے خوں بن گیا
کچھ اماماں صد مکر و فن/ ان کی سانسوں میں افعی کی پھنکار تھی
ان کے سینے میں نفرت کا کالا دھواں/ اک کمیں گاہ سے
پھینک کر اپنی نوکِ زباں/ خونِ نورِ سحر پی گئے

رات کی تلچھٹیں ہیں اندھیرا بھی ہے/ صبح کا کچھ اجالا بھی ہے
ہمدمو! / ہاتھ میں ہاتھ دو

سوئے منزل چلو/ منزلیں پیار کی

منزلیں دار کی/ کوئے دلدار کی منزلیں

دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو

○

(۲) چپ نہ رہو

(لوممبا کے قتل پر)

شب کی تاریکی میں اک اور ستارہ ٹوٹا
طوق توڑے گئے ٹوٹی زنجیر
جگمگانے لگا ترشے ہوئے ہیرے کی طرح / آدمیت کا ضمیر
پھر اندھیرے میں کسی ہاتھ میں خنجر چمکا
شب کے سناٹے میں پھر خون کے دریا چمکے
صبح دم جب مرے دروازے سے گذری ہے صبا
اپنے چہرے پہ ملے خون سحر گزری ہے
خیر ہو مجلس اقوام کی سلطانی کی / خیر ہو حق کی، صداقت کی، جہاں بانی کی
اور اونچی ہوئی صحرا میں امیدوں کی صلیب
اور اک قطرۂ خوں چشم سحر سے ٹپکا
جب تلک دہر میں قاتل کا نشاں باقی ہے
تم مٹاتے ہی چلے جاؤ نشاں قاتل کے
روز ہو جشن شہیدانِ وفا چپ نہ رہو
بار بار آتی ہے مقتل سے صدا چپ نہ رہو، چپ نہ رہو

○

مجید امجد

بس اسٹینڈ پر

''خدایا اب کہ یہ کیسی بہار آئی''

خدا سے کیا گلہ بھائی
خدا تو خیر کس نے اس کا عکس نقش پا دیکھا
نہ دیکھا تو بھی دیکھا اور دیکھا بھی تو کیا دیکھا
مگر توبہ مری توبہ یہ انساں بھی تو آخر اک تماشا ہے
یہ جس نے پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہونا بڑے جتنوں سے سیکھا ہے
ابھی کل تک جب اس کے ابروؤں تک موئے پیچاں تھے
ابھی کل تک جب اس کے ہونٹ محروم زنخداں تھے
ردائے صدزماں اوڑھے، لرزتا، کانپتا، بیٹھا
ضمیر سنگ سے بس ایک چنگاری کا طالب تھا

مگر اب تو یہ اونچی ممٹیوں والے جلوخانوں میں بستا ہے
ہمارے ہی لبوں سے مسکراہٹ چھین کر اب ہم پہ ہنستا ہے
خدا اس کا، خدائی اس کی، ہر شے اس کی، ہم کیا ہیں!
چمکتی موٹروں سے اڑنے والی دھول کا ناچیز ذرہ ہیں

○

احمد ندیم قاسمی

(۱) بیسویں صدی کا انسان

مجھے سمیٹو
میں ریزہ ریزہ بکھر رہا ہوں/ نہ جانے میں بڑھ رہا ہوں
یا اپنے ہی غبارِ سفر میں - ہر پل اتر رہا ہوں
نہ جانے میں جی رہا ہوں
یا اپنے ہی تراشے ہوئے نئے راستوں کی تنہائیوں میں ہر لحظہ مر رہا ہوں

میں اک پتھر سہی، مگر ہر سوال کا، بازگشت بن کر، جواب دوں گا
مجھے پکارو، مجھے صدا دو/ میں ایک صحرا سہی، مگر مجھ میں گھر کے برسو
مجھے مہکنے کا ولولہ دو/ میں اک سمندر سہی مگر آفتاب کی طرح مجھ پہ چمکو
مجھے بلندی کی سمت اڑنے کا حوصلہ دو

مجھے نہ توڑو کہ میں گلِ تر سہی/ مگر اوس کی بجائے لہو میں تر ہوں
مجھے نہ مارو
میں زندگی کے جمال اور گہما گہمیوں کا پیامبر ہوں
مجھے بچاؤ کہ میں زمیں ہوں
کروڑوں کرّوں کی کائنات بسیط میں صرف میں ہی ہوں جو خدا کا گھر ہوں

(۲) آئندہ صدی کا انسان
(جوہری جنگ کے خوفناک امکان کے تناظر میں)

مری صدا پر گرفت شب ہے/ میں پوری شدت سے چیخ کر بھی
سنائی دیتا نہیں کسی کو
مری بصارت کو تیرگی جذب کر رہی ہے
کہ ہر طرف دیکھنے کی خواہش میں
میں نے آنکھوں کی پتلیاں توڑ پھوڑ دی ہیں
مری سماعت سکوت کی اک گونج ہے
اور مرا دماغ ایک کوشش رائیگاں ہے، ریشم کے الجھے ہوئے گچھے کو کھولنے کی
کہ میں نے اکیسویں صدی کو
ضمیر کے آئینے میں دیکھا ہے
اور انسان کو
کچھ ایسا نڈھال پایا ہے
جیسے سرسبز پیڑ کی شاخ
تیز جھونکوں کی زد میں آکر
لٹک پڑی ہو

○

ساحرلدھیانوی

(۱) شہزادے

ذہن میں عظمتِ اجداد کے قصے لے کر
اپنے تاریک گھروندوں کے خلا میں کھو جاؤ
مرمریں خوابوں کی پریوں سے لپٹ کر سو جاؤ
ابر پاروں پہ چلو، چاند ستاروں میں اڑو
یہی اجداد سے ورثہ میں ملا ہے تم کو/ دور مغرب کی فضاؤں میں دہکتی ہوئی آگ
اہل سرمایہ کی آویزش باہم نہ سہی/ جنگ سرمایہ ومحنت ہی سہی
دور مغرب میں ہے ——— مشرق کی فضا میں تو نہیں
تم کو مغرب کے بکھیڑوں سے بھلا کیا لینا؟
تیرگی ختم ہوئی سرخ شعاعیں پھیلیں/ دور مغرب کی فضاؤں میں ترانے گونجے
ختم جمہور کے، انصاف کے، آزادی کے/ ساحل شرق پہ گیسوں کا دھواں چھانے لگا
آگ برسانے لگے اجنبی توپوں کے دہن/ خواب گاہوں کی چھتیں گرنے لگیں
اپنے بستر سے اٹھو/ نئے آقاؤں کی تعظیم کرو
اور ——— پھر اپنے گھروندوں کے خلا میں کھو جاؤ
تم بہت دیر ——— بہت دیر تلک سوئے رہے

○

(۲) طرح نو

سعیِ بقائے شوکتِ اسکندری کی خیر
ماحول خشت بار میں شیشہ گری کی خیر

بیزار ہے کنشت و کلیسا سے اک جہاں
سوداگرانِ دین کی سوداگری کی خیر

فاقہ کشوں کے خون میں ہے جوش انتقام
سرمایہ کے فریب جہاں پروری کی خیر

طبقات مبتذل میں ہے تنظیم کی نمود
شاہنشہوں کے ضابطۂ خودسری کی خیر

احساس بڑھ رہا ہے حقوق حیات کا
پیدائشی حقوق ستم پروری کی خیر

ابلیس خندہ زن ہے مذاہب کی لاش پر
پیغمبران دہر کی پیغمبری کی خیر

صحنِ جہاں میں رقص کناں ہے تباہیاں
آقائے ہست و بود کی صنعت گری کی خیر

شعلے لپک رہے ہیں جہنم کی گود سے
باغِ جناں میں جلوۂ حور و پری کی خیر

انساں الٹ رہا ہے رخ زیست سے نقاب
مذہب کے اہتمام فسوں پروری کی خیر

الحاد کر رہا ہے مرتب جہان نو
دیر و حرم کے حیلۂ غارت گری کی خیر

○

(۳) بنگال

جہان کہنہ کے مفلوج فلسفہ دانو
نظام نو کے تقاضے سوال کرتے ہیں

یہ شاہراہیں اسی واسطے بنی تھیں کیا
کہ ان پہ دیس کی جنتا سسک سسک کے مرے
زمیں نے کیا اسی کارن اناج اگلا تھا
کہ نسل آدم و حوا بلک بلک کے مرے
ملیں اسی لئے ریشم کے تار بنتی ہیں
کہ دختران وطن تار تار کو ترسیں
چمن کو اس لئے مالی نے خوں سے سینچا تھا
کہ اس کی اپنی نگاہیں بہار کو ترسیں

زمیں کی قوت تخلیق کے خداوندو
ملوں کے منتظمو! سلطنت کے فرزندو

پچاس لاکھ فسردہ گلے سڑے ڈھانچے
نظامِ زر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں
خموش ہونٹوں سے دم توڑتی نگاہوں سے
بشر بشر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں

○

خلیل الرحمٰن اعظمی

(۱) میں گوتم نہیں ہوں

میں گوتم نہیں ہوں
مگر میں بھی جب گھر سے نکلا تھا/ یہ سوچتا تھا
کہ میں اپنے ہی آپ کو ڈھونڈنے جا رہا ہوں
کسی پیڑ کی چھاؤں میں میں بھی بیٹھوں گا
اک دن مجھے بھی کوئی گیان ہوگا
مگر جسم کی آگ/ جو گھر سے لے کر چلا تھا

سلگتی رہی/ گھر سے باہر ہوا تیز تھی
اور بھی یہ بھڑکتی رہی/ ایک اک پیڑ جل کر ہوا راکھ
میں ایسے صحرا میں اب پھر رہا ہوں/ جہاں میں ہی میں ہوں
جہاں میرا سایہ ہے/ سائے کا سایہ ہے
اور دور تک
بس خلا ہی خلا ہے

○

(۲) سوداگر

لو گجر بج گیا
صبح ہونے کو ہے
دن نکلتے ہی اب میں چلا جاؤں گا
اجنبی شاہراہوں پہ پھر
کاسۂ چشم لے لے کے ایک اک چہرہ تکوں گا
دفتروں، کارخانوں میں، تعلیم گاہوں میں جا کر
اپنی قیمت لگانے کی کوشش کروں گا

میری آرام جاں! / مجھ کو اک بار پھر دیکھ لو
آج کی شام لوٹوں گا جب
بیچ کر اپنے شفاف دل کا لہو
اپنی جھولی میں چاندی کے ٹکڑے لیے
تم بھی مجھ کو نہ پہچان پائیں تو پھر
میں کہاں جاؤں گا......؟
کس سے آ کر کہوں گا کہ میں کون تھا..........
کس سے جا کر کہوں گا کہ میں کون ہوں..........
○

مظہر امام

(۱) اکھڑتے خیموں کا درد

کہیں بھی جائے اماں نہیں ہے
نہ روشنی میں، نہ تیرگی میں
نہ زندگی میں، نہ خودکشی میں

عقیدے نیزوں کے زخم کھا کر سسک رہے ہیں
یقین کی سانس اکھڑ چلی ہے
نڈھال خوابوں کے ہونٹ سے خاک وخوں کے شعلے ابل رہے ہیں
عزیز قدروں پہ جانکنی کی گرفت مضبوط ہوگئی ہے
پتنگ کی طرح کٹ چکے ہیں تمام رشتے
جو آدمی کو قریب کرتے تھے آدمی سے
نہ فرد کا سائباں سلامت
نہ انجمن کا مکاں سلامت
کوئی خدا ہے تو وہ کہاں ہے؟

مہیب طوفاں مہیب تر ہے
پہاڑ تک ریت کی طرح اڑ رہے ہیں
بس ایک آواز گونجتی ہے
''مجھے بچاؤ! مجھے بچاؤ!!''
(مگر کہیں بھی اماں نہیں ہے)

جو اپنی کشتی پہ بچ رہے گا
وہی علیہ السلام ہوگا

○

(۲) تمہارے لیے ایک نظم

تمہارے لیے میں نے اب تک کوئی نظم لکھّی نہیں ہے

وہ الفاظ جن کے سہارے کبھی ہم کلامی کے انداز سیکھے تھے میں نے
وہ الفاظ اپنے مفاہیم کی کینچلی پھینک کر
دشتِ بے معنویت میں گم سم کھڑے ہیں
میں
ان ساعتوں کی گزرگاہ پر آبلہ پا رواں ہوں
جو
دفتر کی
بیوی کی
بچوں کی
احباب کی
ملکیت ہیں!
میں اب وہ نہیں ہوں/ جو میں تھا

اب اک مردہ انسان کا کوٹ میرے بدن کی کثافت چھپائے ہوئے ہے
میں برسوں کی رسوائیاں
اس کی بوسیدہ جیبوں میں مدفون کرنے میں مصروف ہوں
میں شانوں پہ روزِ ازل سے اسی جھوٹ کا بوجھ ڈھوتا رہا ہوں
جو میں ہوں
جو تم ہو

ذرا مہر برلب لفافے سے اپنی وہ بھولی ہوئی داستانیں نکالو
جو اس شہر کی سرحدیں توڑ کر
غیر ملکوں میں تشہیر پاتی رہی ہیں
لطیفوں میں احساس کا زہر چھپتا نہیں ہے
مسرت فقط نور غازہ نہیں ہے
صرف آرائش پیچ و کاکل نہیں ہے
کہ ان اونچی اونچی دکانوں کے پیچھے وہی ڈھیر ہے ردیوں کا
یہ دنیا اک ایسا مکاں ہے/ جہاں کوئی کھڑکی نہیں
صرف دروازہ ہے ایک/ اندر سے جو بند ہے
اگر کھول پائیں تو کھولیں/ کہ اندر ہمیں ہیں

وہ/ مری روح کی شاہزادی

مرے شوق وارماں کا مرکز نہیں
رات کے چند بے کیف لمحات کو چھوڑ کر
میرا اور اس کا رشتہ/ نہیں ہے کوئی
پھر بھی وہ میرے انفاس کی آمد و شد کا حصہ/ مرے خون کی راز داں ہے

وہ
تمہارے نفس کی حرارت، تمہارے لہو کی روانی سہی
یہ بتاؤ! تمہاری بھٹکتی ہوئی روح کا شاہزادہ بھی ہے
رات کے چند بے کیف و پر کیف لمحات کو چھوڑ کر
تم سے کچھ اس کا رشتہ بھی ہے

بیستونِ الم کاٹ کر کوئی فرہاد جوئے مسرت نکالے اگر
ایک دو گھونٹ تم بھی پیو
ایک دو گھونٹ میں بھی پیوں
اور پھر اپنا زادِ سفر ——— اپنی رسوائیاں
اپنے کاندھوں پہ دونوں اٹھا لیں
اور اس طرح کھو جائیں اک دوسرے میں
جیسے یہ آخری بار ملنا ہو
جیسے کبھی پھر نہ ہم مل سکیں گے

○

بلراج کومل

(۱) پرندہ

پرندہ آسماں کی نیلگوں محراب کے اس پار جاتا ہے
پرندہ بال و پر ہے، آنکھ ہے لیکن ——
سنہری چونچ سے پرواز کرتا ہے
سڑک پر دھوپ ہے اور دھوپ میں سایوں کے ناخن ہیں
گھروں میں خول ہیں اور آنگنوں میں خارا گتے ہیں
کسی کا کون ہے؟ کوئی نہیں، سب اجنبی ہیں حیرت و حسرت میں زندہ ہیں

وہ عورت ہے
وہ خواہش کے لپکتے خنجروں سے پیار کرتی ہے
وہ اس کا ہمسفر ہے، خاک و خوں اس کا مقدر ہے
یہ موج آب ہے، اب پھول ہے، اب پیڑ ہے، کل صرف پتہ ہے
اگر یہ زندگی کرنے کی کوشش میں پریشاں ہیں
یہ اکثر قتل کرتے ہیں/ یہ اکثر قتل ہوتے ہیں
لہو کے پار گلشن ہے، مگر گلشن لہو میں ہے
نگاہوں میں اجڑتے شہر کی مانند تصویروں کا میلہ ہے

ہجوم سنگ و آہن ہیں/کوئی آواز دیتا ہے، کوئی آواز سنتا ہے
مگر آواز سے آواز کا رشتہ نہیں ہوتا
مگر آواز سے آواز کا ہر سلسلہ بے کار ہوتا ہے
یہ منظر تیرتا ہے آبجو میں ہائے لیکن اجنبی کیوں ہے؟
میں منظر ہوں، تسلسل ہوں
مگر میں اجنبی کیوں ہوں؟
یہ فرش آب و گل میرے لئے اک سلسلہ کیوں ہے؟
پرندہ آسماں کی نیلگوں محراب کے اس پار جاتا ہے
پرندہ فاصلہ کیوں ہے؟
پرندہ ماورا کیوں ہے؟

○

(۲) سرکس کا گھوڑا

سپید اور بھورا، بدن کا چھریرا / وہ نٹ کھٹ بچھیرا
خریدا گیا، گاؤں کے ایک میلے میں
لایا گیا، ہنٹروں، چابکوں کی پراسرار دنیا میں
سیکھے وہ انمول دلچسپ کرتب
اڑے چیختے پھیلتے دائروں میں
پھلانگے سلگتی بھیانک تکونیں
اٹھا کر چلے پیٹھ پر رقص کرتے ہوئے بندروں کو
اشاروں کی آواز سن کر وہ لپکے، ہنسے ہنہنائے
تماشائیوں کو لبھائے، رجھائے

وہ سرکس کا گھوڑا
پریشان شہروں میں کرتب دکھاتا / تماشائیوں کے دلوں کو لبھاتا
تحیر، ہنسی، قہقہوں، تالیوں کی فضاؤں میں برسوں چھلانگیں لگاتا
اسی گاؤں کے ایک میلے میں پہنچا
خریدا گیا تھا جہاں سے وہ بچپن میں لیکن وہاں اب؟
وہاں کون تھا؟ اس کو پہچاننے والا کوئی نہیں تھا

○

منیر نیازی

(۱) میں اور شہر

سڑکوں پہ بے شمار گلِ خوں پڑے ہوئے
پیڑوں کی ڈالیوں سے تماشے جھڑے ہوئے
کوٹھوں کی ممٹیوں پہ حسیں بت کھڑے ہوئے

سنسان ہیں مکان کہیں در کھلا نہیں
کمرے سجے ہوئے ہیں مگر راستا نہیں
ویراں ہے پورا شہر کوئی دیکھتا نہیں
آواز دے رہا ہوں کوئی بولتا نہیں

○

(۲) کسی جگہ پر مل کر بیٹھیں

کس ایوان میں مل کر بیٹھیں
کس مرکز کس رستے پر
کس افسوس کے مسکن جاں میں
کس شادی کے چشمے پر
دل کی بات جہاں ہم بانٹیں
ان وقتوں میں رہنے کی
دل لگ جائے جن شہروں میں
ان شہروں میں رہنے کی

○

عمیق حنفی

(۱) معمول

شام چھت سے گھر میں اتری
رات بن کر ایک اک کمرے میں پھیلی
وقت کو اپنی کلائی سے اتارا
اور ٹیبل پر سجا کر
میں نے آزادی کا لمبا سانس کھینچا
یاد اور خوابوں کی پتواریں سنبھالیں
کشتیِ احساس کو تاریک اور بدرنگ لہروں میں اتارا

صبح تک اس کشتیِ احساس پر
کر کے لے آؤں گا سورج کو سوار
اور پھر میری کلائی
وقت کی پابند ہو کر
شام تک انجام دے گی
کارہائے ناگوار

(۲) سندباد (ملکِ بے سحر و شام)

کچھ برس پہلے سویرے منھ اندھیرے
اک پہاڑی پر پہنچ جاتے تھے ہم
ایک کالے سخت تکیے سے اٹھا کر اپنا سر
ادھ جگا سورج ابھر کر دیکھ لیتا تھا ہمیں
ہم سحر خیزوں سے شرما کر جھکا لیتا تھا سر
دفعتاً اس کے لبوں سے پھوٹ پڑتی تھی ہنسی
ہاتھ وہ ہم سے ملاتا تھا بہ صد حسن تپاک
جسم و جاں میں پھیل جاتی تھی شگفتہ تازگی

شام کو جب جھیل کے پانی میں ڈالے اپنے پاؤں
دائرہ در دائرہ موجیں اٹھا دیتے تھے ہم
تب تھکا ماندہ، انیندا، مضمحل سورج
اپنے خوابستان میں روپوش ہو جانے سے قبل
مسکرا کر ہم سے کہتا شب بخیر

اور چل پڑتے تھے ہم سب اپنے گھر
اپنے دل کے دائرہ در دائرہ موجوں میں سورج گھیر کر

اور اب؟
اب تو یہ بھی یاد رکھنا ہے محال
کس طرف پورب ہے، پچھّم ہے کدھر
کب اگا کرتا ہے سورج اور کب جاتا ہے ڈوب
کس کو بستر میں پتہ!
کس کو دفتر میں خبر!!

○

(۳) مشین زادوں کی بستی

ایک دیوار کے اس طرف
گھر میں ہم سائے کے ناچ گانے ہوئے
شادیانے بجے/ رات بھر جشن ہوتا رہا
اور دیوار کے اس طرف
لوگ سوتے رہے

شارع عام پر حادثہ ہو گیا
آدمی کٹ گیا/ اس کا سر پھٹ گیا
بھیڑ بہتی رہی
بات کرنے میں جو تھے مگن بات کرتے رہے
قہقہے چیخ کے پر کترتے رہے
اور اکثر جو خاموش تھے چپ گزرتے رہے
آدمی مر گیا

اک محلے میں دوپہر کو

عین بازار میں
قتل کا واقعہ ہو گیا
اور پولس گواہوں کی خاطر بھٹکتی رہی
دھڑ دھڑاتی ہوئی ٹرین آئی - گئی
اور پہیوں کی چنگھاڑ سے کان پھٹنے لگے
ٹرین کی پٹریاں جیوں پڑی تھی پڑی ہی رہیں
نہ ہوئیں ٹس سے مس!

آدمی ٹرین کی پٹریاں بن گئے
ٹرین کی پٹریاں آدمی بن سکیں گی کبھی؟

○

عزیز قیسی

(۱) چور بازار

کاٹھ کے بیل، مرد کے شیشے/ پتلیاں عورتیں پسینے کی
بوندیاں، گل مہک شمیم بدن/ چاک دل، زخم جیب و پیراہن
کار، لاری، کواڑ، آنکھیں، فن/لعل والماس آہن وفولاد
قہقہے، چہچہے، فغاں، فریاد/ سوئی، ہاتھی، اناتھ بچے، دل
تشنگی، تلخیاں، تجلّی، وید
کون سی آس، کون سی امید
کون سی جنس چاہیے تجھ کو
ہر ضرورت کا مال حاضر ہے
مال یہ سب کہاں سے آتا ہے؟/ بیچتا کون؟ کون لاتا ہے؟
کس سے کس نے اسے خریدا ہے/ کتنے داموں یہ اٹھتا جاتا ہے؟
کوئی بتلا سکے تو بتلائے
بمبئی کی عریض سڑکوں پر/ جب کوئی تازہ جنس دنیا کی
—— کوئی نکھرا حسین رخ —— میں نے/کوئی لہکی ہوئی جبیں دیکھی
یہی دل میں خیال آیا ہے

تجربہ کار کوئی سوداگر/کوئی دلال یا کوئی سارق

سرِ بازار اس کو لایا ہے

جانے کس روز بیچ ڈالے گا

وہ بھی ایسے —— کہ اس کے داموں کا

دوسرے ہاتھ کو پتہ نہ چلے

جانے کس روز کتنے دروازے

چھو کے یہ جنس بے بہا آخر

کسی فٹ پاتھ کے کنارے پر

لاٹ کی لاٹ بن کے اٹھ جائے

زندگی ہے کہ مال سرقے کا

چور بازار ہے کہ دنیا ہے

○

(۲) رسول کاذب

رسول مصلوب کے دو ہزار برسوں کے بعد یہ واقعہ ہوا..................

یہ اس زمانے کی بات ہے جب رسول خورشید راس الافلاک پر چمکتا تھا
وہ اک زمستاں کی نیم شب کا سماں تھا
(وہ نیم شب اک رقیق چادر نہ جانے کب سے زمیں کے مردار کالبد پر
پڑی ہوئی ہے اور اس کے مسموم روزنوں سے گلے سڑے جسم کا تعفن ابل رہا ہے)
شجر حجر دھند کے کفن میں چھپی ہوئی خامشی کے سینے میں چبھ رہے ہیں
عناصر وقت منجمد ہے
تمام روحیں فشارِ مرقد میں مبتلا ہیں
اور ایسے ہنگام میں اک آواز نور افگن/ظہور خورشید کی بشارت سے
دشت و در کو جلا رہی تھی/ ہزار ہا شب گزیدگاں کے ہجوم سے
میں نے اس کو دیکھا
وہ خون آدم میں اپنی زندہ خزاں زدہ/ انگلیاں ڈبوئے ہوئے کھڑا تھا

ہجوم سے ایک اک گنہ گار کو بلاتا اور اس کے ماتھے پر کلمۂ صبح لکھ رہا تھا
تمام مردے خزاں زدہ انگلیوں کے چھونے سے جاگتے تھے
گناہ گار نفس تھا میں بھی/ امید وار شفا تھا میں بھی
پھر اس زمستاں کی نیم شب میں ہزار لمحات شاق گزرے
اور ایک لمحے نے میرے زخم جگر کو چھو کر کہا/ مداوائے غم کی ساعت قریب ہے
سجدہ ریز ہو جا/ یہ اس زمانے کی بات ہے جب زمین کے
بے شمار مردے زمین کا بپتسمہ لے رہے تھے/ (لہو کا بپتسمہ لے رہے ہیں)
رسول خورشید کی صدا بھی تو مرگئی تھی، کہر میں وہ کھو گیا، اور............
اسی زمستاں کی نیم شب میں خبر ملی ہے/ کہ اک شبستان نور و نکہت میں
بے کفن لاش پر وہ بیٹھا ہوا ہے
اپنے خزاں زدہ ہاتھ سے
کسی کے لہو کی تقصیر کر رہا ہے/ اور اپنے کاسے کو بھر رہا ہے
خبر ملی ہے
لہو وہ خورشید کا لہو ہے

○

(۱) پیغامبر

میں کوئی کرنوں کا سوداگر نہیں
اپنے اپنے دکھ کی تاریکی لئے/تم آ گئے کیوں میرے پاس
غم کے انگاروں کو کاندھوں پر دھرے/ بوجھل صلیبوں کی طرح
آشفتہ مو افسردہ رو/ ہونٹ محروم تکلم پر سراپا التماس
اس تمنا پر کہ تم کو مل سکے/غم کے انگاروں کے بدلے
مسکراہٹ کی کرن.......... جینے کی آس
میں مگر کرنوں کا سوداگر نہیں
میں نہیں جوہر شناس/صورت انبوہِ دریوزہ گراں
سب کے دل میں قہقہوں سے چور/لیکن آنکھ سے آنسو رواں
سب کے سینوں میں امیدوں کے چراغاں
اور چہروں پر شکستوں کا دھواں/ زندگی سب سے گریزاں
سوئے مقتل سب رواں/ سب نحیف و ناتواں
سب کے سب اک دوسرے کے ہم سفر/اک دوسرے سے بدگماں
سب کی آنکھوں میں خیالِ مرگ سے خوف و ہراس

میری باتوں سے مری آواز سے/تم نے یہ جانا کہ میں بھی
لے کے آیا ہوں تمہارے واسطے وہ معجزے
جن سے بھر جائیں گے پل بھر میں تمہارے/ان گنت صدیوں کے لاتعداد زخم
دم بخود سانسوں کو ٹھہرائے ہوئے بے جان جسم
منتظر ہیں قم باذنی کی صدائے سحر کے/ایشیا پیغمبروں کی سرزمیں
اور تم اس کے زبوں قسمت مکیں.......... تیرہ جبیں
من وسلویٰ کے لیے دامن کشا/قحط خوردہ زار و بیمار و حزیں
صرف تقدیر و توکل پر یقیں/تم کو شیریں طرب کی چاہ لیکن بے ستونِ غم کی سل کو
چیرنے کا حوصلہ یارا نہیں/تم ید بیضا کے قائل بازوئے فرہاد کی قوت سے بہرہ ور نہیں
تم کہ ہو کوہِ گرفتہ..........زندگی سے دور
مردہ ساحروں کی بے نشاں قبروں کے سجادہ نشیں
خاکداں کی اس گلِ تاریک کا/میں بھی اک پیکر ہوں پیکر گر نہیں
میں کوئی کرنوں کا سوداگر نہیں/ریت کے تپتے ہوئے ٹیلے پہ استادہ ہو تم
سایۂ ابر رواں کو دیکھتے رہنا تمہارا جزو دیں
سات قلزم موجزن چاروں طرف/اور تمہارے بخت میں شبنم نہیں
اپنے اپنے دکھ کی بوجھل گٹھریوں کو/تم نے کھولا ہے کبھی؟
اپنے ہم جنسوں کے سینوں کو ٹٹولا ہے کبھی؟
سب کی روحیں گرسنہ..........سب کی متاع درد میں
دوسرے کا خون پینے کی ہوس/ایک کا دکھ دوسرے سے کم نہیں

ایک کا دکھ تشنگی، بے چارگی/ دوسروں کا دکھ مگر افراط مے...... دیوانگی
پیار اور نشے کا دکھ/ اپنے انباروں سے مل کر چھانٹ لو
پیاس اور نشے کا دکھ اک دوسرے سے بانٹ لو
پھر تمہاری زندگی شاید نہ ہو/ شاکی عرش بریں ورحمت للعالمیں
میں کوئی کرنوں کا سوداگر نہیں

O

(۲) بیروت

یہ سر بریدہ بدن ہے کس کا / یہ جامۂ خوں کفن ہے کس کا
یہ زخم خوردہ ردا ہے کس کی / یہ پارہ پارہ صدا ہے کس کی
یہ کس لہو سے زمین یاقوت بن گئی ہے
یہ کس کی آغوش کس کا تابوت بن گئی ہے
یہ کس نگر کے سپوت ہیں جو

دیارِ انگار میں کھڑے ہیں

یہ کون بے آسرا ہیں
جو تیغِ قاتلاں سے / کٹی ہوئی فصل کی طرح

جا بجا پڑے ہیں

یہ کون ماں ہے
جو اپنے لختِ جگر کو ملبے میں ڈھونڈتی ہے
یہ کون بابا ہے
جس کی آواز شورِ محشر میں دب گئی ہے / یہ کون معصوم ہیں
کہ جن کو / سیاہ آندھی دیئے سمجھ کر بجھا رہی ہے

انھیں کوئی جانتا نہیں/ انہیں کوئی جاننا نہ چاہے
یہ کس قبیلے کے سر بکف جاں نثار ہیں/ جن کو کوئی پہچانتا نہیں ہے
کوئی پہچاننا نہ چاہے/ کہ ان کی پہچان امتحاں ہے
کہ ان کی پہچان میں زیاں ہے
نہ کوئی بچہ، نہ کوئی بابا، نہ کوئی ماں ہے
محل سراؤں میں خوش مقدر شیوخ چپ

بادشاہ چپ ہیں

حرم کے سب پاسبان

عالم پناہ چپ ہیں

منافقوں کے گروہ کے

سربراہ چپ ہیں

تمام اہلِ ریا کے جن کے لبوں پہ ہے

لاالہ چپ ہیں

(۳) اے مرے شہر!

مرے شہر! / میں تجھ سے نادم ہوں
اس خامشی کے لیے/ جب عدو تیری خوابیدہ گلیوں پہ
بھیگی ہوئی رات میں/ آگ برسا رہا تھا
میں چپ تھا/ مرے شہر!
میں تیرا مجرم ہوں/ اس بے حسی کے لیے
جب ترے بام و در/ طاق و دہلیز و دیوار
تیرے مکینوں کے لیے/ خونِ حنا رنگ سے
تر بتر ہو رہے تھے/ تو میں چشم بستہ تھا

اے مرے آباء کے مسکن! / میں تیرا گنہ گار ہوں
جب ترے آئینہ رنگ چشموں سے/ اک جوئے خوں آملی تھی
تو میرے لبوں پر/ کوئی حرفِ ماتم نہ آیا
کہ جب تیرے زرتاب خرمن پہ/ سفاک بجلی گری تھی
تو میں تیری جلتی ہوئی کھیتیوں کی طرف/ بادلِ چاک و با چشمِ پرنم نہ آیا

میں شرمندہ ہوں/ اے مرے برگزیدہ بزرگوں کی بستی
کہ اس درد کی فصل میں/ تیرے فرزند شاعر کی نوکِ قلم پر
ترا اسمِ اعظم نہ آیا/ یہ سب کچھ بجا ہے
مگر اے مقدس زمیں/ تیری مٹی نے جب میری صورت گری کی
تو ورثے میں تو نے/ مجھے ایسا دل دے دیا تھا
جو اپنے دکھوں کے سمندر نہ دیکھے/ مگر دوسروں کے نم چشم سے باخبر ہو
مجھے تیری گل نے وہ احساس بخشا/ جو اپنے عزیزوں کی لاشوں پہ
پتھر بنا دم بخود/ مگر کاہش دیگراں پر
سدا نوحہ گر ہو

مرے شہر!/ جب تیرے سینے سے
مینارِ خوں اٹھ رہا تھا/ میں اس وقت
غافل نہیں تھا/ میں بے حس نہیں تھا
مگر اس گھڑی میرا سارا وطن/ ظلم کی زد میں تھا
میرا سارا چمن/ آگ کی حد میں تھا
ساری دنیا کی مظلومیت، میری آہوں میں تھی/ ساری دنیا ہی میری نگاہوں میں تھی
اس سمے/ تو ہی تو تھا
پشاور کا/ لاہور کا
اور/ بنگال کا نام، کوہاٹ تھا

کاشمیر/کوریا
ہیروشیما کا ویتنام کا نام، کاہوٹ تھا/ ساری مظلوم دنیا کے ہر شہر کا نام، کاہوٹ تھا

اے مرے شہر! / میرا قلم اپنے کردار پر
تجھ سے نادم سہی/ خود سے نادم نہیں
تو مرا شہر ہے/ پر مرا شہر تو آج ساری زمیں ہے/ فقط تو نہیں ہے

○

(۴) منصور

وہ کیا خطا تھی؟

کہ جس کی پاداش میں ابھی تک / میں قرنہا قرن سے شکارِ عبودیت

طوق در گلو...... پابہ گل رہا ہوں

وہ جرم کیا تھا؟ / کہ زندگی بھر تو میں

ترے آستاں پہ سجدوں کی نذر گزرانتا ہوں

اور اس کا ثمرہ ملے / تو بس کاسۂ گدائی - عذاب عالم

تو کیا مری بے طلب ریاضت - مجاہدت کا یہی صلہ ہے

مجھے گلہ ہے

خدائے تنور و آب سادہ مجھے گلہ ہے

مجھے تری بندگی کے صدقے میں کیا ملا ہے؟

کہاں ہے وہ تیرا دستِ فیاض جس کے جود و سخا کے قصے

سنہرے حرفوں میں ہر صحیفے کے حاشیے بن کے رہ گئے ہیں

کہاں ہیں وہ تیری جنتیں جن کی داستانیں

بڑے تکلف سے عرش سے فرش پر اتاریں

کہاں ہیں وہ تیرے شہد وشکر کے بے انتہا ذخیرے
کہ جن کی کاذب جھلک سے تو نے
گرسنہ مخلوق کو ازل سے غلام رکھا
کہاں ہیں ان واہمی کھلونوں کے اونچے بازار کس طرف ہیں
میں ان روایات کی حقیقت سے باخبر ہوں
یہ سب وہ رنگین دام تھے جن کے بل پہ تو نے
زمیں پہ بغض وعناد ظلم وفساد وحرص وہوس کے ایسے
دھوئیں اڑائے
کہ نسل آدم کروڑ فرقوں میں بٹ گئی ہے
یہ وحدہٗ لاشریک دنیا ہزار خطوں میں کٹ گئی ہے
اگرچہ روز الست سے لے کر اب تلک
بے شمار صدیوں کے فاصلے ہیں
مگر یہ تاریخ کی کہن سال راہبہ، جو
ترے کلیساؤں بت کدوں اور حرم سراؤں کے بعد آئی تو کہہ رہی ہے
سنو نشیبوں کے باسیو! / یہ جہاں تمہارا ہے
یہ زمیں یہ فلک یہ خورشید و ماہ انجم فقط تمہارے ہیں
دوسرا ماسوا تمہارے کوئی نہیں ہے
خدا و بندہ کی تلخ تفریق بے حقیقت ہے بے سبب ہے
الوہیت کا فریب تم میں سے ہی کسی خود فریب انساں کا واہمہ تھا

یہ واہمہ اس قدر بڑھا پھر

کہ رفتہ رفتہ تمام کونین کا خداوند بن گیا ہے

اور اس خداوند/ اس تصور کے آسرے پر

تمہارے کچھ ہم نفس رفیقوں نے

تم کو محکوم و پابہ زنجیر کر دیا ہے

یہی وہ پہلا گناہ پہلا فریب پہلا فسوں ہے جس نے

مزاج انساں کو غاصبانہ شعور بخشا

اگر یہ سچ ہے/ اگر یہ سچ ہے خدائے تنور و آبِ سادہ

تو من و تو کی پست و بالا فصیل مسمار کیوں نہ کر دوں

کہ ان مراتب کی کشمکش سے ہی

آج میں اور میرے ہم جنس

اس طرح ایک دوسرے کے غنیم ہیں

جس طرح زمستاں کی برف باری کے بعد گرگانِ گرسنہ

بھوک کی شقاوت سے تنگ آ کر

اس ایک لمحے کے منتظر ہوں

جب ان کا کوئی نحیف ساتھی غنودگی کا شکار ہو

اور سب کے سب اس پہ ٹوٹ کر چیر پھاڑ ڈالیں

کہ اس شکم کے مہیب دوزخ سے بڑھ کر کوئی نہیں جہنم

نہ اس جہاں میں نہ اس جہاں میں

○

وحید اختر

(۱) سیلِ بے چہرگی

میرے اطراف جنگل ہے انسانوں کا
بوجھ اتنا زمیں سے سنبھلتا نہیں
روشنی اور تازہ ہوا جنس نایاب ہے
پیٹ، کشکولِ دریوزہ گر، سرد، ویراں، تہی
پھٹ نہ جائے زمیں بوجھ سے

اتنے چہرے کہ ہر چہرہ گم ہو گیا
اتنی آبادیاں ہیں کہ انسان جنگل میں گم
میرے چاروں طرف جسم کا دشت ہے نوحہ خواں
یہ امڈتے ہوئے تند سیلاب کی طرح بے چہرہ آبادیاں
مجھ کو ڈر ہے بہا لے نہ جائیں کہیں زندگی کے نشاں

○

(۲) شب و روز تماشا

ذہن جب تک ہے/ خیالات کی زنجیر کہاں کٹتی ہے
ہونٹ جب تک ہیں/ سوالات کی زنجیر کہاں کٹتی ہے

بحث کرتے رہو، لکھتے رہو نظمیں، غزلیں
ذہن پر صدیوں سے طاری ہے جو مجلس کی فضا
اس خنک آنچ سے کیا پگھلے گی
سوچ لینے ہی سے حالات کی زنجیر کہاں کٹتی ہے

نیند میں ڈوبی ہوئی آنکھوں سے وابستہ خواب
تیز کرنوں کی سنانوں پہ ہیں رسوا سر عام
یہ شہید اپنی صلیبوں سے پلٹ آتے ہیں دل میں سرِ شام
صبح ہوتی ہے مگر رات کی زنجیر کہاں کٹتی ہے

دن گزر جاتا ہے بے ثمرۂ بے فیض کد و کاوش میں

ایک ان دیکھے جہنم کی تب و تابش میں
جسم اور جاں کی تگ و تاز کی پرسش میں
غم و حسرت و محرومی کی ہر کاہش میں
طلب و ترک طلب سلسلۂ بے پایاں
مرگ ہی زیست کا عنوان ہے ہر خون شدہ خواہش میں
غم سے بھاگیں بھی تو فریاد و شکایات کی زنجیر کہاں کٹتی ہے

وقت وہ دولتِ نایاب ہے آتا نہیں ہاتھ
ہم مشینوں کی طرح جیتے ہیں پابندئ اوقات کے ساتھ
وقت بے کار گزرتا ہی چلا جاتا ہے
کرسیوں، میزوں سے بے معنی ملاقاتوں میں
سیکڑوں بار کی دہرائی ہوئی اگلی ہوئی باتوں میں
زندہ رہنے کی تمنا کی مداراتوں میں
شکم و جاں کی عبادات کہاں کٹتی ہے

جن کو مانا ہے نہ پوجے گی کبھی دیدہ وری
جن خداؤں سے طبیعت ہے نفور/ ان کے حضور
ہر گھڑی حمد و سلام اور درود/ ان کی چوکھٹ پہ قیام اور قعود
ان کے قدموں پہ سجود/ جانتی ہے یہ مری بے ادبی

یہ ہے سب خدمت دنیا طلبی / کیا کریں پھر بھی ستائے جو بہت تشنہ لبی
ہائے آشفتہ سری
مدح و تسبیح و مناجات کی زنجیر کہاں کٹتی ہے

صبح سے شام تلک اتنے خدا ملتے ہیں ہر کافر کو
سجدۂ شکر سے انکار کی مہلت نہیں ملنے پاتی
سیکڑوں لاکھوں خداؤں کی نظر سے چھپ کر
خود سے مل لینے کی رخصت نہیں ملنے پاتی
خود پرستوں سے بھی طاعات کی زنجیر کہاں کٹتی ہے

بے نیازانہ بھی جینا ہے فقط ایک گماں
فکر موجود کو چھوڑیں تو غم ناموجود
ساتھ ہر سانس کے ہے سلسلۂ ہست و بود
غم آفاق کو ٹھکرائیں کریں ترکِ جہاں
پھر بھی یہ فکر کہ جینے کا ہو کوئی امکاں
بے نیازی سے غم ذات کی زنجیر کہاں کٹتی ہے
ذہن میں اندھے عقیدوں کی سیاہی بھر لو
تا کہ اس نگری میں
کبھی افکار کے شعلوں کا گزر ہو نہ سکے

جبر کا حکم سنو
ہونٹ تم اپنے سی لو
تا کہ ان راہوں سے
کبھی لفظوں کا سفر ہو نہ سکے
ذہن و لب پھر بھی نہیں چپ ہوتے
ان کے خاموش سوالات کی زنجیر کہاں کٹتی ہے
پیچ در پیچ خیالات کی زنجیر کہاں کٹتی ہے

○

(۳) کفن فروش

ضعیف العقل کہنہ سال بونے
کمر خستہ، خمیدہ فہم، حس مردہ ضمائر سوختہ بالشتیے
اک لاش پر بیٹھے ہوئے ہیں
بصارت سے تہی آنکھیں اندھیرے میں چمکتی ہیں
بصیرت سے تہی اذہان اجالوں میں بھٹکتے ہیں
خود اپنی قبر پر بیٹھے ہوئے بوڑھے مجاور
گھروں کو اپنے لاوارث کا ترکہ بھیجتے ہیں

جو ترکہ لاش کا تھا بٹ چکا ہے/ اب اس کے دفن کی تجویز ہوتی ہے
حکومت سے سنہرا اور روپہلا اک کفن مانگا ہے
مجاور اور کرگس پھر اکٹھا ہیں/ چلو ہم بھی تماشا چل کے دیکھیں
کہ اندھے بانٹتے ہیں اپنے کنبوں میں کفن کیونکر

بہت ہی دور کے ہم اک تماشائی ہیں
پھر بھی محرمانِ راز سے پوچھیں
یہ نعشِ بے کفن کلچر کی ہے، مذہب کی ہے یا زبان کی؟

○

(۴) صحرائے سکوت

خموشی اوڑھے ہوئے رات کی سیاہ ردا
فضا میں پھونکتی پھرتی ہے سحر مرگ آثار
زمیں کی گود میں سوئے ہوئے مناظر کو
پلا کے زہر سلاتی ہے اور گہری نیند
وسیع کھیتیاں پھیلائے پاؤں سوتی ہیں
کھڑے ہیں سنتری بن کر ہزاروں کوہ و جبال
اداس اداس سے بہتے ہیں مست رو دریا
کہ تیز پانی ہے آداب خامشی کے خلاف
چمکتے گونجتے شہروں کی شاہراہوں پر
ہر ایک چیز بہت دیر سے ہے پابستہ
دکانیں بند ہیں فٹ پاتھ سرد و ویراں ہیں
خود اپنے نور کو روتے ہیں روشنی کے ستوں
وہ راستے جو مضافات تک پہونچتے ہیں
قدم قدم پہ انھیں بند گیٹ ملتے ہیں

بٹی ہوئی ہے بڑے چھوٹے خانوں میں فطرت
یہ تیرگی ہے جو وحدت کو توڑ دیتی ہے
یہ خاموشی ہے جو ہر مظہر حقیقت کو
اکیلا جہل کی ظلمت میں چھوڑ دیتی ہے
ہر ایک چہرے کو دے کر نقاب ظلمت کی
تمام دہر کو ظلمت میں ڈھانپ لیتی ہے
کہ کوئی آنکھ کسی اور کو نہ دیکھ سکے
کہ کوئی چہرہ کسی اور کو نہ پہچانے
اٹھو جو پھینک کے چہرے کی روح پوش نقاب
اس آرزو میں کہ فطرت کی بھی نقاب اٹھے
تو ہر طرف سے جھپٹتی ہے رات، تیرہ رات
خموشی حلقۂ گرداب تنگ کرتی ہے
کہ مل سکے نہ زبانوں کو نغمگی سے نجات
کہ ہونے پائے نہ صبح اور نہ آفتاب اٹھے
کوئی یہ کہتا ہے سرگوشیوں میں چپ سو جاؤ
زبان داں ہے کوئی اور نہ کوئی محرم راز
نہ کوئی آنکھ ہے بینا، نہ کوئی قلب گداز
تمہارے چاروں طرف خامشی کے پہرے ہیں
کہو نہ کچھ کہ ہیں دروازے آنکھ کھولے ہوئے

کہو نہ کچھ کہ ہیں دیواریں گوش بر آواز
دریچے درزِ دِمعانیِ ناشنیدہ ہیں

نظر نظر سے یہ کہتی ہے آنکھ بند کرو
زباں زباں سے یہ کہتی ہے کوئی کچھ نہ کہو
ہر ایک لفظ کی منت 'ہم ان کہے اچھے'
معانی کی یہ لجاجت، ہمیں زباں نہ ملے
سکوت پیشہ زبانوں کی گفتگو بھی سکوت
جو لوگ پہنے عبا و قبا سرِ منبر
بہت بلندی سے پیغمبرانہ بولتے ہیں
جب ان کے لفظوں کی کھولو گرہ تو خاموشی
زباں پہ ذکر ہے اقدار روح و مذہب کا
مگر جو سینوں میں جھانکو تو ہونکتے صحرا
کہیں جو دل کو ٹٹولو تو ایک در کے سوا
کوئی ضمیر نہ ایمان، کوئی حق نہ خدا
سکوت کے ہیں پیمبر یہ غازیٔ گفتار
خیال جوڑنا چاہے صدا سے گر رشتہ
تو بات ہی نہیں کٹتی، زبان کٹتی ہے
وہی خموشی جو کرتی ہے ضبط کی تلقین

ذرا میں زخم پہ مجروح ناگ کی مانند
صدا کو ڈسنے کی خاطر وہی پلٹتی ہے
جہاں جہاں بھی جلیں لفظ کے سنہرے چراغ
ادھر ادھر کو وہ کف در دہاں جھپٹتی ہے
رہائی مملکت خامشی کا آئیں ہے
یہی زباں ہے، یہی ہے صدا، یہی دیں ہے
اسی زبان میں کرتی ہے بات خاموشی
کچھ اس طرح کہ سنائی نہ دے صدا دل کی
جہاں بھی جاؤ وہیں خامشی کی گونج کا شور
یہ گونج ہے وہ اندھیرا ڈراؤنا جنگل
جہاں زبان گم، لفظ گم، معانی گم
دل و دماغ و نظر کی ہر اک کہانی گم

بہت زمانے سے ہم دشتِ خامشی میں گم
زبان و لفظ کے رشتے کی جستجو میں ہیں
اندھیری راتیں چراغوں کی آرزو میں ہیں
مگر یہ کھوکھلی آوازوں کا مہیب سکوت
ریا کا زہر پیے، لفظ کا لئے تابوت
بلا رہا ہے کہ آؤ مصالحت کے لیے

یہ چاہتا ہے کہ لفظوں کو گہری قبروں میں
کچھ اس طرح سے کریں دفن پھر وہ اٹھ نہ سکیں
یہ چاہتا ہے کہ اس سازشِ گناہ میں ہم
جلائیں ایسی چتائیں کہ پھر وہ جی نہ سکیں
یہ چاہتا ہے کہ اس سازشِ گناہ میں ہم
شریک ہو کے گلا اپنا آپ ہی کاٹیں
بہت زمانے سے اس دشتِ خامشی میں ہم
یہ دیکھتے ہیں کہ ہر روز ایک زندہ لفظ
کسی گناہ کے تاریک قیدخانے میں
سسک سسک کے خموشی کا زہر پیتا ہے
پھر اس کے بعد بہت سارے بے زباں عفریت
قرونِ وسطیٰ کے گونگے غلاموں کی مانند
جھکائے آنکھ کفن اس کا قطع کرتے ہیں
کہ حاکموں کے گناہوں کا پردہ رہ جائے

○

(۱) عہد حاضر کی دلربا مخلوق

زرد بلبوں کے بازوؤں میں اسیر
سخت، بے جان، لمبی کالی سڑک
اپنی بے نور دھندلی آنکھوں سے
پڑھ رہی ہے نوشتۂ تقدیر

بند کمروں کے گھپ اندھیروں میں
بلیاں پی رہی ہیں دودھ کے جام
ہوٹلوں سنیما گھروں کے قریب
چمچماتی ہوئی نئی کاریں
اور پنواڑیوں کی دوکانیں
'پرس' والوں کے انتظار میں ہے

ادھ پھٹے پوسٹروں کے پیراہن
آہنی بلڈنگوں کے جسموں پر

کتنے دلکش دکھائی دیتے ہیں
بس کی بے حس نشستوں پر بیٹھی
دن کے بازار سے خریدی ہوئی
آرزو، غم، امید، محرومی
نیند کی گولیاں، گلاب کے پھول
کیلے، امرود، سنگترے، چاول
پینٹ گڑیا، شمیز، چوہے دان
ایک اک شے کا کررہی ہے حساب
عہدحاضر کی دلربا مخلوق

○

(۲) کیا تم کو شرم نہیں آتی

کیا تم کو شرم نہیں آتی
تم اپنے بچوں کی مدافعت کے محتاج ہو
تم ان کے دست و بازو کی طاقت
اپنے آرام اور حفاظت کے لیے
استعمال کرنا چاہتے ہو
کیا تمھیں معلوم نہیں
کہ پہلے زمانے میں بوڑھے اور بزرگ
بچوں کی مدافعت اور حفاظت کیا کرتے تھے
تم نے اپنے بچوں سے کبھی محبت نہیں کی
اور ان کے دشمنوں سے کبھی نفرت نہیں کی
اور اس کے بعد بھی تم ان سے وہ کچھ
چاہتے ہو
جو تم نے اپنے بزرگوں کے لیے نہیں کیا
کیا تم کو شرم نہیں آتی

○

(۳) نیا امرت

دواؤں کی الماریوں سے سجی اک دوکاں میں
مریضوں کے انبوہ میں مضمحل سا
اک انساں کھڑا ہے
جو اک نیلی کبڑی سی شیشی کے سینے پہ لکھے ہوئے
ایک اک حرف کو غور سے پڑھ رہا ہے
مگر اس پہ تو 'زہر' لکھا ہوا ہے
اس انسان کو کیا مرض ہے
یہ کیسی دوا ہے؟

○

(۴) پھر سفر بے سمت بے منزل ہوا

برف بے موسم گری/ چٹان سے میدان تک
بے درختوں کی زمیں/ بے اون بھیڑوں کے لیے
زندہ رہنا اور مرنا دونوں مشکل ہو گئے
آنکھ بے منظر خلا کو/ تکتے تکتے تھک گئی
وقت کی رفتار کو/ بتلانے والی سوئیاں
ہندسوں کی بے صلہ، بیکار گردش کرتے کرتے رک گئیں
آڑے، ترچھے، اونچے، نیچے راستے
برف کی موٹی تہوں میں چھپ گئے
پھر سفر بے سمت بے منزل ہوا
برف کے اجلے بدن کی/ منجمد نیلی رگوں میں
کون سورج بن کے دوڑے
کس طرح یہ برف پگھلے
آگ بے شعلہ ہوئی
پھر سفر بے سمت بے منزل ہوا
بے اون بھیڑوں کے لیے
زندہ رہنا اور مرنا دونوں مشکل ہو گئے

○

محمد علوی

(۱) کون

کبھی دل کے اندھے کنویں میں
پڑا چیختا ہے
کبھی دوڑتے خون میں
تیرتا ڈوبتا ہے
کبھی ہڈیوں کی سرنگوں میں بتی جلا کر
یونہی گھومتا ہے
کبھی کان میں آ کے
چپکے سے کہتا ہے تو
اب تلک جی رہا ہے
بڑا بے حیا ہے
مرے جسم میں کون ہے یہ
جو مجھ سے خفا ہے

○

(۲) خوف

یہ سب دکانیں یہ راستے
یہ ہجوم لوگوں کا
چلتی، رکتی، بسیں، یہ کاریں
یہ سب کا سب یہ بتا رہا ہے
کہ شہر اچھا بھلا رہا ہے
مگر ابھی اک دکاں جلے گی
مگر ابھی اک چھری چلے گی
یہ خوف کیوں سر اٹھا رہا ہے

○

(۳) ڈپریشن

کوئی حادثہ
کوئی سانحہ
کوئی بہت ہی بری خبر
ابھی کہیں سے آئے گی
ایسی جان لیوا فکروں سے
سارا دن ڈوبا رہتا ہوں
رات کو سونے سے پہلے
اپنے آپ سے کہتا ہوں
بھائی مرے
دن خیر سے گزرا / گھر میں سب آرام سے ہیں
کل کی فکریں کل کے لیے اٹھا رکھو
ممکن ہو تو / اپنے آپ کو
موت کی نیند سلا رکھو

ندا فاضلی

(۱) جنگ

سرحدوں پر فتح کا اعلان ہو جانے کے بعد
جنگ!
بے گھر بے سہارا
سرد خاموشی کی آندھی میں بکھر کر
ذرہ ذرہ پھیلتی ہے
تیل/گھی/آٹا
کھنکتی چوڑیوں کا روپ بھر کر
بستی بستی ڈولتی ہے

دِن دہاڑے
ہر گلی کوچے میں گھس کر
بند دروازوں کی سانکل کھولتی ہے
مدتوں تک
جنگ
گھر گھر بولتی ہے
سرحدوں پر فتح کا اعلان ہو جانے کے بعد

(۲) قومی یکجہتی

وہ طوائف
کئی مردوں کو پہچانتی ہے
شاید اس لیے
دنیا کو زیادہ جانتی ہے
اس کے کمرے میں
ہر مذہب کے بھگوان کی ایک ایک تصویر لٹکی ہے
یہ تصویریں
لیڈروں کی تقریروں کی طرح نمائشی نہیں
اس کا دروازہ رات گئے تک
ہندو/مسلم
سکھ/عیسائی
ہر مذہب کے آدمی کے لیے کھلا رہتا ہے
خدا جانے
اس کے کمرے کی سی کشادگی
مسجد اور مندر کے آنگنوں میں کب پیدا ہوگی

(۳) ایک لٹی ہوئی بستی کی کہانی

بجی گھنٹیاں / اونچے مینار گونجے
سنہری صداؤں نے / اجلی ہواؤں کی پیشانیوں پر
رحمت کے / برکت کے
/ پیغام لکھے / وضو کرتی صبحیں
کھلی کہنیوں تک منور ہوئی / جھلمائے اندھیرے
بھجن گائے آنچل نے / پوجا کی تھالی سے بانٹے سویرے
کھلے دوار / بچوں نے بستہ اٹھایا
بزرگوں نے پیڑوں کو پانی پلایا
نئے حادثوں کی خبر لے کے / گلیوں میں اخبار آیا
خدا کی حفاظت کی خاطر / پولیس نے
پجاری کے مندر میں / ملا کی مسجد میں
پہرہ لگایا / خدا!
ان مکانوں میں لیکن کہاں ہے
سلگتے محلوں کے دیوار و در میں
وہی چل رہا ہے / جہاں تک دھواں ہے

○

(۴) ایک قومی رہنما کے نام

مجھے معلوم ہے/ تمہارے نام سے منسوب ہیں
ٹوٹے ہوئے سورج/ شکستہ چاند
کالا آسماں/ کرفیو زدہ راہیں
سلگتے کھیل کے میداں/ روتی چیختی مائیں
مجھے معلوم ہے/ چاروں طرف
جو یہ تباہی ہے/ حکومت میں
سیاست کے تماشے کی گواہی ہے/ تمہیں
ہندو کی چاہت ہے/ نہ مسلم سے عداوت ہے
تمہارا دھرم
صدیوں سے تجارت تھا/ تجارت ہے
مجھے معلوم ہے لیکن/ تمہیں
مجرم کہوں کیسے/ عدالت میں
تمہارے جرم کو ثابت کروں کیسے
تمہاری جیب میں خنجر/ نہ ہاتھوں میں کوئی بم تھا
تمہارے رتھ پہ تو/ مریادا پرشوتم کا پرچم تھا

(۵) راستے کی منطق

ابھی ابھی جو گیا ہے دھکیل کر تم کو
اسے برا نہ کہو/ اپنے پیر مت روکو
جو چل سکو تو چلو/ ورنہ راستہ چھوڑو
تمہارے پیچھے بھی کچھ لوگ آ رہے ہوں گے
دیا کی بھیک نہ مانگو/ بڑھے چلو یونہی
اڈتی بھیڑ کی لہریں ہیں تیز دھار بہت
یہاں کسی سے کسی کی نظر نہیں ملتی
نہ دوستی
نہ محبت
نہ فلسفہ کوئی
یہ راستہ ہے، یہاں راستے کی منطق ہے
تلاش سب کو ہے/ موقع کی بات ہے ساری
کوئی پھسلتا ہے
کوئی پھلانگ جاتا ہے/ جو آگے بڑھتا ہے دو چار کو گراتا ہے
ابھی ابھی جو گیا ہے دھکیل کر تم کو
اسے برا نہ کہو

○

شفیع مشہدی

اسلاف کے نام

ہمارے مورث اعلیٰ ہو تم .... سچ ہے
یہ سچ ہے تم معزز ہو، مکرم ہو، معظم ہو
تمہارا فرض ہے ہم پر .... یہ سچ ہے
مگر اس قرض کا تم سود مت مانگو
ہمیں تم مت بلاؤ ...... ہم
تمہارے نقش پا پر چل نہیں سکتے
تمہارے پاؤں کے جوتے بڑے تھے/ ہمارے پاؤں چھوٹے ہیں
تمہاری ناک اونچی تھی ہماری آنکھ نیچی ہے
تمہیں تو سربلندی راس آئی
ہمارا سر ہے ان شانوں پہ بھاری
مبارک ہو تمہیں اس خلد کی چھاؤں/ جہاں پر دودھ کی نہریں ہیں جاری
یہاں تو چھاتیوں میں بھی نہیں ہے/ یہاں تو ندیاں خوں تھوکتی ہیں
تمہاری کج کلاہی سانپ بن کر ہمارے پاؤں سے لپٹی ہوئی ہے
انا اب بے بسی ہے/ سفر اب گمرہی ہے

ہمیں تم مت بلاؤ ہمارے پاؤں ننگے ہیں
کہ ان راہوں میں اب کانٹے ہی کانٹے ہیں
جو پیہم آبلوں سے کھیلتے ہیں مگر نشتر نہیں دیتے
ہمیں تم مت بلاؤ/ہمیں تو سخت راہوں سے گزرنا ہے

سوا ہے درد اپنا راہ اپنی
ہمارے مورث اعلیٰ ہو لیکن
ہمارے درد سے نا آشنا ہو
خدا کا شکر تم زندہ نہیں ہو
ہماری طرح شرمندہ نہیں ہو

○

زبیر رضوی

تیرگی میں جاگتی مخلوق

پرانی بات ہے
لیکن یہ انہونی سی لگتی ہے/ عجب وہ رات تھی
چاروں طرف کہرے کی چادر تھی/ نظر کچھ بھی نہ آتا تھا
صدا کے لب سلے تھے/ دور تک آہٹ نہ تھی کوئی
وہ ایسی رات تھی جو ختم ہونے میں نہ آتی تھی
مکیں سارے گھروں میں قید تھے/ ان کے دلوں پر ایک نیلا خوف طاری تھا
مکینوں نے ہرے طاقوں میں رکھے
آسمانی سب صحیفوں کے ورق کھولے/ عذابوں کے وہ سب ابواب
اک اک کر کے پڑھ ڈالے/ جہاں منحوس راتوں کا بیاں تھا
اور قیامت خیز راتوں کے جہاں آثار لکھے تھے
مگر اس رات کا کوئی بیاں ان میں نہ مل پایا
مکیں سب آبدیدہ ہو گئے/ اور پھوٹ کر روئے
سنا ہے پھر مکینوں نے
حکیموں کی وہ سب نادر کتابیں کھول کر دیکھیں

جنھوں نے نوعِ انساں کو رموزِ آگہی بخشے
مگر وہ سب کتابیں بھی
طلوعِ صبح کا مژدہ نہ دے پائیں
مکیں پھر آبدیدہ ہو گئے
اور پھوٹ کر روئے
اچانک اک کرن / کہرے کی چادر چیر کر نکلی
گھروں کے اندھے آنگن میں اتر آئی
مکیں خوش تھے کہ اب کچھ دیر میں
سورج کے ہاتھوں قتلِ شب ہوگا
مگر سورج نہیں نکلا
مکینوں کے دلوں پر پھر سے نیلا خوف طاری تھا
رگوں میں خون جامد تھا!!

○

(۲) طویل نظم صادقہ سے ماخوذ

صادقہ !ایک رزمیہ

جرم وسزا کے نام پر/ قید وقفس کے واسطے

صدق وصفا کے نام پر

پہلے کی جنگ اور تھی آج کی جنگ اور ہے

پہلے محاذ اور تھے آج محاذ اور ہیں

سنگ بنام دشمناں، پھول بنام دوستاں

زیرزمین تجربے ایٹمی بم کے زلزلے/ آگ ہوا میں بھر گئے

ساری فضائے نیلگوں کالے دھوئیں سے اٹ گئی

ساتھ اگر کوئی نہ دے خیمۂ اقتدار کی حکم عدولی گر کرے

اس کو سزائے موت ہے/کوئی بھی ارض خاک ہو کتنے بھی فاصلے پہ ہو

کوئی بھی نسل ورنگ ہو چاہے نجف ہو نجد ہو

کابل وویت نام ہو سارے سگ زمانہ ہیں

کس کی بساط لشکر غیض وغضب کے سامنے

آنکھ اٹھا کے چل سکے

کون حریف بن سکا سامنے آ کے ٹک سکا
فتح کے سارے سلسلے ختم ہیں اس مقام پر
آمروقت ہے جہاں
کل بھی جہاں پناہ تھا آج بھی وہ عظیم ہے
شاہ جہاں اسے کہو شاہ زماں اسے کہو
صادقہ! ظلم وجبر سے کانپتی اس زمین پر
صدق وصفا کے قافلے ہاتھ میں مشعلیں لئے
صوت وصدا کے شور میں سینہ سپر چلے تو ہیں
آمروقت کے خلاف
ایک صدائے احتجاج بن کے کھڑے ہوئے تو ہیں

○

باقر مہدی

(۱) کھوکھلے آدمی

ہم کھوکھلے آدمی ہیں/ ہم خاشاک اندوہ آدمی ہیں
ایک دوسرے کا سہارا لئے ہوئے ہیں
حیف! سر میں تنکے بھرے ہیں
جب کبھی آپس میں ہم
اپنی سوکھی آوازوں سے سرگوشی بھی کرتے ہیں، تو یہ
خامشی اور بے معنویت ہی کا اک اظہار ہے
جیسے سوکھی گھاس سے گذرے ہوئے
یا ہمارے خالی تہہ خانے میں
ٹوٹے شیشے کے برتنوں پہ چوہے کے پیروں کی صدا
ایک شکل بے ہیئت، ایک سایہ بے رنگت
ایک مفلوج طاقت، ایک اشارہ بے حرکت
اور وہ جو اپنی کھلی آنکھوں سے سرحد پار کر کے
موت کی مملکت میں جا چکے ہیں/ اگر کبھی ہمیں یاد بھی کرتے ہیں
تو بھٹکی ہوئی شہ زور روحیں نہیں سمجھتے
صرف کھوکھلے آدمی
خاشاک اندوہ آدمی

○

قاضی سلیم

(۱) راستہ کس طرف جا رہا ہے

چیختی
چنگھاڑتی
سرسراتی ہوا
پے در پے باد گولے۔ بگولے/ سانس دھرتی کی شاید اکھڑنے لگی ہے
شش جہت کے گھٹا ٹوپ اندھکار میں
بنی نوع آدم کے شجرے کی سوکھی ہوئی پتیاں/ بوکھلائی ہوئی
گھومتی ڈولتی پھر رہی ہیں
راستہ کس طرف جا رہا ہے
الجھے دھاگوں کی پھرکی کہاں گھومتی ہے/ اس کا محور کہاں ہے
یہ کھلتی چلی ہے یا اسے داہنے ہاتھ پر/ کوئی الٹا لپیٹے چلا جا رہا ہے
راستہ کس طرف جا رہا ہے
میری دھرتی کہاں کھو گئی/ ٹمٹماتا ہوا نیلگوں دیپ کب تک جلے گا
خلاؤں کے بے آب ساگر امڈتے چلے آ رہے ہیں
خلاؤں کے بے آب ساگر میں ہم جیسے رم خوردہ بے وزن

اور بے زمیں چوکڑی بھر رہے ہیں
راستہ کس طرف جارہا ہے/ وہ مرے کرب کی آگ ہے
سرخ شعلے کی صورت دہکتا ستارہ/ کہاں چھپ گیا؟
جس کی اندھی پرستش میں میرا قبلہ
پچھلے آکاش کوطول میں کاٹنے کی تمنا لیے چل پڑا تھا
وہی آواز رفتار کی بے بسی بن گئی ہے
آج بھی میرے پیروں میں زنجیروں کی طرح لپٹی ہوئی ہے
زادِراہ پھینک دو/ بے حاصلی کے سبک ہاتھ پھیلاؤ
.... جیسے فرشتے/ ہواؤں کو بانہوں میں اپنی سمیٹے ہوئے
عرش سے فرش تک
آتے جاتے ہیں......سب راستے
ساری سیمائیں ان کے لیے بے اثر ہیں

○

(۲) کہو- کچھ تو کہو

کہو شاید ہمارے گوشت کے اندر
لہو کے بر قیوں میں
اور دھمکتی دھمنیوں میں
آنکھ بن کر اب بھی کوئی جاگتا ہے
وہی سچائیوں کی قبر کا آسیب
اندھے آئینوں کے عکس کا کوندا
ہمیشہ کے سمندر کا بلاوا
موت کی سانسوں کا لہرا
بھیک کا کاسہ
کچھ ایسا جس کی شاید اک چھون سے
ہماری خودکشی قربانیوں کا نام پاتی ہے

کہو — جو کچھ بھی ہے
— جیسا بھی ہے
کہو — کچھ تو کہو وہ جھوٹ ہی پھر آج دہراؤ

○

(۳) وائرس

مسیحِ وقت تم بتاؤ کیا ہوا/ زباں پر یہ کسیلا پن کہاں سے آ گیا
ذرا سی دیر کے لیے پلک جھپک گئی تو راکھ کس طرح جھڑی
سنا ہے دور دیس سے/ کچھ ایسے وائرس ہمارے ساحلوں پہ آ گئے
جن کے تابکار سحر کے لیے/ امرت اور زہر دونوں ایک ہیں
اب کسی کے درمیان کوئی رابطہ نہیں/ کسی دوا کا درد سے کوئی واسطہ نہیں
ہم ہوا کی موج موج سے
درد کھینچتے ہیں چھوڑتے ہیں سانس کی طرح
لہو کی ایک ایک بوند زخم بن گئی
رگوں میں جیسے بد دعائیں تیرتی ہیں
پھانس کی طرح/ مسیحِ وقت تم بتاؤ کیا ہوا
دیوِ علم کے چراغ کا کیوں بھلا بجھ گیا
دھواں دھواں بکھر گیا/ سنو کہ چیختا ہے کام —— کام
''کوئی کام'' کچھ نہیں
جاؤ ساحلوں کی سمت ہو سکے تو روک لو
اس نئے عذاب کو/ ناخدا کی آخری شکست کو
سمندروں کی ریت چھانتے رہو

کمار پاشی

(۱) بستیاں زندہ رہیں گی

تم زمیں پر ایک بھی سایہ اگر دیکھو تو سمجھو: آسمانوں کے تلے یہ بستیاں زندہ رہیں گی
وہ جو ماتم کر رہے ہیں رو رہے ہیں اپنے بچوں کو
نہیں آتا یقیں ان کو کہ وہ جیتے ہیں اب تک
تتلیاں ان کے تعاقب میں گئی ہیں
وہ جو ماتم کر رہے ہیں اپنے بچوں کا
انھیں کہہ دو
پہاڑوں سے ندا آتی نہیں تو یہ نہ سمجھیں شہر مردہ ہو گئے ہیں
آج کی تاریخ میں سورج نہ چمکے گر مکانوں پر
تو یہ مطلب نہ ہو ظلمت مقدر ہو چکی ہے
رات کے اس پار بھی اک رات ہے لمبی، انوکھی اور ڈراونی رات، یہ سچ ہے
کہ اس کے ہاتھ تصویر ہے اک سیل حیرت کی

جو ماتم کر رہے ہیں ان سے یہ کہہ دو
لہو بہتا ہے جب آبادیوں میں، تنگ اور تاریک رستوں پر

تو اک آواز آتی ہے
ہزاروں ہاتھ اٹھتے ہیں
فصیلوں سے پرے بھی چیخ کی آواز لمبی گونج بن کر کوندتی رہتی ہے صدیوں تک
ڈراؤنے لفظ گدھوں کی طرح اڑتے ہیں شہروں پر
کوئی کتنا بھی ڈر کر بند کر لے گھر کے دروازے
مگر وہ چین سے بتی بجھا کر سو نہیں سکتا

اندھیرے میں ہزاروں ہاتھ اٹھتے ہیں
اندھیرے میں ہزاروں چیختے ہیں، بھوت بن بن کر ڈراتے ہیں
جو ماتم کر رہے ہیں ان سے یہ کہہ دو
سمجھ لیں آسمانوں کے تلے یہ جگمگاتی بستیاں زندہ رہیں گی، مر نہیں سکتیں

بمل کرشن اشک

(۱) جسم کی روشنی

جو دوست ملتا ہے ہنس کے کہتا ہے اب تو چہرے پہ روشنی ہے
میں اس سے کہتا ہوں میرا اندر بکھر گیا ہے
وہ مسکراتا ہے ـــــــ جسم کی بات ہو رہی ہے
میں کس کو سمجھاؤں میرے اندر سے میرے باہر کا واسطہ بے ثبات ٹھہرا
جو میرے اندر پہ بیتتی ہے وہ میرے باہر سے مختلف ہے
میں اپنے اندر سے دھیرے دھیرے گزر رہا ہوں
میں اپنے اندر سے مر رہا ہوں
مگر ہر اک دوست جسم کے صبح و شام سے موت ماپتا ہے
جو جسم کی روشنی ہے سب کے لیے بہت ہے
میں کیسے دکھلاؤں دوستوں کو وہ رات وہ تیرگی جو اندر اتر گئی ہے

○

(۲) آزاد روشنیاں

میں چاہتا ہوں کے کوٹ کی ایک جیب میں روشنی کی کرنوں کے ڈھیر رکھ لوں
اور اک میں آزادیوں کے نغموں کے ساز سُر ہوں
کہ جس طرف سے میں گزروں/ تاریکیاں نہ ٹھہریں
کہ جس طرف سے میں گزروں/ بیڑی نہ ہتھکڑی کی صدا پکارے
میں اس جہاں کی تلاش میں ہوں
کہ جس میں ہر شخص
اپنی جیبوں میں روشنی کے صبیح صد رنگ
سنگ ریزوں کو کھنکھنائے
کہ جس میں ہر شخص حریت کے
لطیف نغموں کو گنگنائے
درخت پر سات رنگ کی اجنبی سی چڑیا
سحر سلگتے ہی جیسے مجھ کو چڑا کر کہتی ہے
اشک صاحب فریب کیوں دے رہے ہیں
ہر شخص جانتا ہے
کہ آپ کے گھر کی کھونٹیوں پر جو کوٹ ہیں
ان کی دونوں جیبیں پھٹی ہوئی ہیں

○

(۱) ایک کتبہ

یہ مرا المیہ ہے/ میں اس وقت اس کھیل میں آ کر شامل ہوا
جب ہر اک شکل/ اپنے لہو کی مچلتی ہوئی آگ سے سرخ تھی ....
آج صدیوں کی سوئی ہوئی نفرتیں جاگ اٹھی ہیں
آنکھیں وہ دوزخ ہیں جن میں/ ہر اک شعلہ اک دوسرے سے جدا
رنگ میں آگ میں نقش میں جاگتا ہے/ مجھے پہلے دن سے یہاں
اپنے ہاتھوں سے اپنی رگیں کاٹ کر/ خوں بہانے کی لذت ملی ہے
یہیں میرے حصے میں میری بدی آئی ہے
سارے رشتوں میں قائم فقط ایک رشتہ رہا ہے
میں اب آنے والی رتوں کی ہری کونپلوں، کل کے سورج کی امید میں
شام کے وقت پتے اڑاتی ہواؤں کے ماتم میں شامل نہیں ہوں
میں ان میں نہیں ہوں جو ہوں گے/ میں اپنے سوالوں کی زنجیر میں قید ہوں
اور شک اور انکار کے رات دن سے گزرتا ہوں
میرے لئے معجزے اور پرانی کتابوں میں لکھی ہوئی ساری سچائیاں
مردہ نسلوں کی تاریک قبروں پہ مٹتی ہوئی تختیاں ہیں

مجھے اپنے اجداد کی ہڈیوں میں کبھی زندہ ہونے کی خواہش نہیں ہے
مجھے اتنا معلوم ہے/ میرے اور موت کے درمیاں سانس کا ایک لمحہ ہے
اور عمر کا ایک جھونکا/ مرے واسطے زندہ رہنے کا کوئی بہانا نہیں ہے

○

(۲) مقبرہ

ہوا نے پھیلا دیے ہیں بازو
زمیں کا چہرہ بدل گیا ہے
''نئی بشارت کا مرحلہ ہے''
مگر ابھی تک
ہمارے گھر میں
وہی تصور کی مفلسی ہے
گئے زمانے کی تیرگی ہے
مزارِ ماضی کے گنبدوں میں
ہے سوچ محبوس
پھڑ پھڑاتی ہے، سر پٹکتی ہے
اک دریچے سے دوسرے تک بھٹک رہی ہے
کوئی تو نیلے کبوتروں کو
نئی فضا کی اڑان دے دے
کوئی تو ان زرد فاختاؤں کو دور کا آسمان دے دے

○

شہاب جعفری

(۱) سورج کا شہر
(غریب شہر کی ڈائری سے)

نہیں! —— یہ سورج کے شہر کا آدمی نہیں ہے
کہ یہ تو مرنے کے بعد فٹ پاتھ پر پڑا ہے
یہ لاش ہم سب کی طرح سورج کے ساتھ گردش میں کیوں نہیں ہے
پڑھو تو اس ڈائری میں کیا ہے؟

نچے کھچے اک ورق پہ کچھ یوں لکھا ہوا تھا

میں اپنی دنیائے فکر و فن تج کے آج بن باس میں پڑا ہوں
ضرورتوں میں گھرا ہوا ہوں
یہاں تو دو اور دو کا حاصل ہمیشہ ہی چار ہاتھ آیا
کہ پانچ ناممکنات میں ہے
عظیم فن کار کا قلم ہو کہ کارخانے
کسی کو تخلیق حسن کی آرزو نہیں ہے

مقدس آگ ان کے دل کے یوں پیٹ کے جہنم میں جل رہی ہے
کہ زندگی کی جو قوتیں ہیں وہ صرف زندہ ہی رہنے میں صرف ہو رہی ہیں
مشین کی طرح ذہن بھی کام کر رہے ہیں
رگوں میں جیتے لہو کے بدلے رقیق لوہا بھرا ہوا ہے
مشین کی طرح پانو چلتے ہیں/ آدمی کا جلال گردش میں سرنگوں ہے
ارادہ واختیار اک اضطراب سنگیں ہے جس سے بچ کر
کوئی نہیں دو گھڑی کسی سے جو بے غرض رک کے بات کر لے
(کسے خبر، آدمی کے دو میٹھے بول کو میں ترس گیا ہوں)

یہاں یہ تحریر آنسوؤں سے مٹی ہوئی تھی اور اسے سے آگے
یہ شہر سورج کا شہر ہے، اس کے روز و شب کا پتہ نہیں ہے
نہ آج تک وقت اور تاریخ کا مجھے علم ہو سکا ہے
کہ میرے احساس میں کوئی آج ہے نہ کل/ اور یہ رات ہے یا سیاہ سورج؟
غروب ہو کر بھی آسمان و زمیں سے پیہم گزر رہا ہے
بس اس جہاں میں سیاہ و روشن ہمیشہ دن ہے
ہمیشہ سورج ہی اپنے سر پر کھڑا ہوا ہے
یہ کائنات اک شکستہ گاڑی ہے ایک پہیے پہ چل رہی ہے
زمین کا چاند کیا خبر کس اندھیرے پاتال میں گرا ہو
ہر ایک شے بھاگتی ہوئی ایک دوسرے کی تلاش میں گم

بس اک تصادم
ہر ایک شخص ایک دوڑتی لاش ہے کہ اک دوسرے سے وحشت زدہ، گریزاں
سب اپنے سورج سے منہ چھپائے تلاش میں وقت کی ہراساں
کسی کو اتنی بھی شام ملتی نہیں کہ تھوڑا اداس ہو لیں
یہاں یہ جملے عجیب سے تھے لہو کے دھبوں سے مٹ گئے تھے

○

(۲) سرِ راہے

کون سی بستی ہے یہ؟/کس طرح کے لوگ ہیں؟
سر سے پا تک صرف ہاتھ اور پانو!؟
کس لیے نکلے تھے گھر سے ـــــــ ان کے چہرے کیا ہوئے؟

راستوں کے پیچ و خم میں/ٹوٹتی بنتی قطاریں
دز دِنا معلوم سے خائف متاعِ تیز رفتاری چھپائے
دھار پر تلوار کی چلتی ہوئی
ہر قدم اک دوسرے کو کاٹتی پرچھائیاں
اک یقینِ بے ثباتی سے ہراساں/اپنی اپنی آرزو سے بدگماں
لہر کی مانند ہر منظر گریزاں
اور ہر منظر ہے کیا؟
چند بے ترتیب سی ٹیڑھی لکیریں
جسم یا پاگل ہوا؟
جا بجا رنگوں کے چھینٹے/خون یا ہونٹوں کی لالی؟

دور تک ہے دھوپ اور سائے کی گردش

پاپ پن؟ عشق و ہوس؟

نیکی بدی؟/ ان سب کی اس تجرید میں

کون ہے کس کے تعاقب میں پتہ چلتا نہیں

زندگی کے سارے روپ آپس میں گم

ان میں ہر روپ ایک ''میں'' ہے ایک ''تم''

کتنی بار اک دوسرے کے پاس سے گذرے مگر

کون کس سے پوچھتا؟

میں کون ہوں تم کون ہو؟

○

محمود ایاز

(۱) منجمد آنکھیں

کھلی آنکھوں کو کوئی بند کر دو
کھلی آنکھوں کی ویرانی سے ہول آتا ہے
کوئی ان کھلی آنکھوں کو بڑھ کر بند کر دو
یہ آنکھیں اک انوکھی یخ زدہ دنیا کی
ساکت روشنی میں کھو گئی ہیں
اب ان آنکھوں میں
کوئی رنگ پیدا ہے، نہ کوئی رنگ پنہاں ہے
نہ کوئی عکس گلبن ہے
نہ کوئی داغِ حرماں ہے
نہ گنج شائیگاں کی آرزوئے بے نہایت ہے
نہ رنج رائیگاں کا عکس لرزاں ہے
اگر کچھ ہے تو بس
اک یخ زدہ دنیا کا نقشِ جاوداں ہے/ یہ آنکھیں اب
شعاع آرزو کی ہر کرن سے یوں گریزاں ہے
کہ پتھر بن گئی ہیں/ یہ آنکھیں مر گئی ہیں

○

(۲) شب چراغ

بسوں کا شور، دھواں، گرد، دھوپ کی شدت
بلندو بالا عمارات، سرنگوں انساں
تلاش رزق میں نکلا ہوا یہ جم غفیر
لپکتی بھاگتی مخلوق کا یہ سیل رواں
ہراک کے سینے میں یادوں کی منہدم قبریں
ہر ایک اپنی ہی آواز پا سے روگرداں
یہ وہ ہجوم ہے جس میں کوئی کسی کا نہیں
یہ وہ ہجوم ہے جس کا خدا فلک پہ نہیں
اور اس ہجوم سر راہ سے گزرتے ہوئے
نہ جانے کیسے تمہاری وفا، کرم کا خیال
مری جبیں کو کسی دستِ آشنا کی طرح
جو چھو گیا ہے تو اشکوں کے سوتے پھوٹ پڑے
سموم ورنگ کے صحرا میں اک نفس کے لیے

چلی ہے باد تمنا تو عمر بھر کی تھکن
سرِ مژہ سمٹ آئی ہے ایک آنسو میں
یہ وہ گہر ہے جو ٹوٹے تو خاک پا میں ملے
یہ وہ گہر ہے جو چمکے تو شب چراغ بنے

○

افتخار عارف

(۱) یا سریع الرضا اغفر لمن لا یملک الا الدعا

یہ دنیا سور کے گوشت کی ہڈی کی صورت
کوڑھیوں کے ہاتھ میں ہے
اور میں نان و نمک کی جستجو میں در بدر قریہ بہ قریہ مارا مارا پھر رہا ہوں
ذرا سی دیر کی جھوٹی فضیلت کے لیے
ٹھوکر پہ ٹھوکر کھا رہا ہوں
منزل عز و شرف سے گر رہا ہوں
اور مری انگشتری پر یا علی لکھا ہوا ہے
مگر انگشتری پر یا علی کندہ کرا لینے سے کیا ہوگا
کہ دل تو مرحبوں کی دسترس میں ہے
مسلسل نرغۂ حرص و ہوس میں ہے
یہ عالم ہے کہ آنکھیں دیکھتی ہیں اور دل سینوں میں اندھے ہو چکے ہیں
اور ایسے میں کوئی حرف دعا اک خواب بنتا ہے
کبھی سلمان آتے ہیں
کبھی بوذر، کبھی میثم کبھی قنبر مری ڈھارس بندھاتے ہیں

کمیل آتے ہیں، کہتے ہیں
پکارو افتخار عارف، پکارو
اپنے مولا کو پکارو
اجیب دعوۃ الداع کا دعوہ کرنے والے کو پکارو
یہ مشکل بھی کوئی مشکل ہے دل چھوٹا نہیں کرتے
کریم اپنے غلاموں کو کبھی تنہا نہیں کرتے
کبھی رسوا نہیں کرتے

○

(۲) ایک سوال

میرے آبا و اجداد نے حرمت آدمی کے لیے
تا ابد روشنی کے لیے
کلمۂ حق کہا
مقتلوں، قید خانوں، صلیبوں میں بہتا لہو، ان کے ہونے کا اعلان کرتا رہا
وہ لہو حرمت آدمی کی ضمانت بنا
تا ابد روشنی کی علامت بنا
اور میں پا برہنہ سرِ کوچۂ احتیاج
رزق کی مصلحت کا اسیر آدمی
سوچتا رہ گیا
جسم میں میرے ان کا لہو ہے تو پھر یہ لہو بولتا کیوں نہیں

○

زاہد ڈار

نئے شہر

گھرے شہروں میں رہنے سے وسعت کا احساس مٹا
لامحدود خلاؤں کی خاموشی کا/ خوف مٹا

اب آرام ہے
(جنگل کا جادو اور ہواؤں کا سنگیت نہیں تو کیا ہے)
اب آرام! کہ اب اگیان کے پیدا کردہ ہاتھ نہیں
ظالم ہاتھ کہ جن ہاتھوں میں ہاتھ دیے
مذہب کے ویرانوں میں میں مارا مارا پھرتا تھا/ اب آرام
(سمندر کی آواز نہیں تو کیا ہے)
اس بستی کی سب گلیوں میں چلنے کی آزادی ہے
اس بستی کی گلیوں کے ناموں میں نیکی اور بدی کے نام نہیں
سیدھے سادے نام ہیں جیسے: لالچ، غصہ، بھوک، محبت، نفرت
سب گلیوں میں چلنے کی آزادی ہے/ شہر نہیں ہے چاروں جانب شور نہیں
ہے کیا ہے

گہرے شہروں میں رہنے سے عظمت کا احساس مٹا
لمبے حملوں پر جانے کا، قدرت سے ٹکرانے کا ارمان مٹا
اب آرام ہے شہروں میں —— انسان مٹا

○

عبدالاحد ساز

آخری پیام

اب کوئی نوح نہیں آئے گا/ ایٹمی جنگ کے طوفان میں جو
کشتیِ امن بنائے/ نوعِ انساں کی بقا کی کوئی تدبیر کرے
نہ محمد نہ براہیم، نہ موسیٰ نہ مسیح/ منہدم قدروں کے اس دور میں جو
اک نئے عہد نئی قدر کی تعمیر کرے/ افقِ عصر پہ اُمڈے ہوئے خدشے کے تئیں
اے مرے دیش کے باسی/ مرے صدیوں کے رفیق
ہم اکیلے ہیں بہت
اب یہاں کرشن کی بنسی ہے، نہ وہ رام کا سوز
نہ وہ گوتم کی بصیرت، نہ مہاویر کا تپ
نہ وہ چشتی کے ترانے ہیں، نہ نانک کی نگاہ
اب نہ تہذیب، نہ آدرش، نہ پہچان کوئی باقی ہے
اب نہ ست یگ کے پلٹ آنے کا امکان کوئی باقی ہے
اور جب یوں ہے تو پھر ہے یہ مقامِ حیرت
اے مرے دیش کے باسی مرے نادان رفیق
عرصۂ دہر ہی پر موت مسلط ہے تو پھر

اپنے ہی ملک میں ہم دست و گریباں کیوں ہیں

چاک ہے پیرہن وسعت عالم ہی تو پھر/ ہم یہاں شکوہ گر تنگیٔ داماں کیوں ہیں

جذبۂ خیر سے بھی بڑھ کر

ترے اور مرے بیچ میں آج

مشترک قدر ہے موجود تو بس

آسمانوں سے اترتی ہوئی تنہائی ہے

لا مرے دوست...... ذرا ہاتھ بڑھا

اسی تنہائی کے رشتے کو تعین دے دیں

ختم ہوتی ہوئی اس دنیا میں

ہاتھ میں ہاتھ لئے جینے کے ساماں نہ سہی

ہاتھ میں ہاتھ لئے مرنے کا امکان تو ہے

○

کشور ناہید

(۱) جاروب کش

دوسروں کی سیوا
پتھروں کی سیوا کے برابر ہے
بہن، بیوی اور ماں کے رشتوں کی خاطر
جینے والی
تم اپنے لئے بھی تو جیو
دیکھو کنول کا پھول کیسے عالم
اور کیسے ماحول میں اپنی انا
اور اپنے وجود کا اعلان کرتا ہے
تم کیوں آٹھ سال چھوٹے بھائی
کے غصے بھرے تحکم کو مان کر
کھڑکی سے جھانک کر مسکراتے چہرے
کی تلاش سے آنکھیں چرا لیتی ہو
تم کیوں پینتیس برس کی عمر کی ہو کر
خود کو سنوارنا بند کر دیتی ہو

کہ تمہیں اپنے شوہر کے زہر میں بجھے
فقروں سے لاش کی بو آتی ہے
تم ماں ہونے کے ناطے
اپنے اندر کے بچے کو
گوشت پوست کے بچوں کی بھینٹ چڑھا کر
ماں مامتا کا نام دیتی ہو!
جیسے کچے رنگوں کے دھاگے
پانی کے ایک ہی قطرے سے
رنگ چھوڑ دیتے ہیں
یہ سب رشتے
کچے رنگوں کے دھاگے ہیں
سب پتھر ہیں
ان کے اوپر چلو تو بھی لہولہان
ان کو سہو، تو بھی لہولہان
پر اپنے لئے جینا کیوں ممکن نہیں
میری بنو
سورج مکھی کی طرح
گھر کے حاکم کی رضا پر
گردن گھماتے گھماتے

میری ریڑھ کی ہڈی چٹخ گئی ہے
جسم کا سارا بوجھ سہنے والی ہڈی
چٹخ گئی ہے

(۲) میں کون ہوں

موزے بیچتی، جوتے بیچتی عورت میرا نام نہیں
میں تو وہی ہوں جس کو تم دیوار میں چن کے
مثل صبا بے خوف ہوئے
یہ نہیں جانا
پتھر سے آواز کبھی بھی دب نہیں سکتی

میں تو وہی ہوں رسم و رواج کے بوجھ تلے
جسے تم نے چھپایا
یہ نہیں جانا
روشنی گھور اندھیرے سے کبھی ڈر نہیں سکتی
میں تو وہی ہوں گود سے جس کی پھول چنے
انگارے اور کانٹے ڈالے
یہ نہیں جانا
زنجیروں سے پھول کی خوشبو چھپ نہیں سکتی

میں تو وہی ہوں، میری حیا کے نام پہ تم نے
مجھ کو خریدا، مجھ کو بیچا
یہ نہیں جانا
کچے گھڑے پر تیر کے سوہنی مر نہیں سکتی

میں تو وہی ہوں جس کو تم نے ڈولی بٹھا کے
اپنے سر سے بوجھ اتارا
یہ نہیں جانا
ذہن غلام اگر ہے قوم ابھر نہیں سکتی

پہلے تم نے میری شرم و حیا کے نام پہ خوب تجارت کی تھی
میری ممتا، میری وفا کے نام پہ خوب تجارت کی تھی
اب گودوں میں اور ذہنوں میں پھولوں کے کھلنے کا موسم ہے
پوسٹروں پہ نیم برہنہ
موزے بیچتی، جوتے بیچتی عورت میرا نام نہیں

○

(۳) نیلام گھر

موت کا ذائقہ/لفظوں کے پیکر میں
اس کے ہونٹوں سے ٹپکتا ہے
وہ نفرتوں کو بوسوں کا رنگ دے کر
میرے منہ پہ نیلے نیلے داغ ڈال کر
یہ جتانا چاہتا ہے
کہ اسے میرے جسم کو ہر طرح استعمال کرنے کا حق ہے
یہ حق بھی کیا عجیب ہوتا ہے
حق جتانے کی خواہش
محکومیت کی ڈھال پر اپنا چھتر بناتی ہے/حق جتانے کی خواہش
ہر کذب اور ریاکاری کو صدقے ہوتی
محبتوں کا نقاب اڑھاتی ہے
مگر نقاب کے نیچے سے چہرہ
اب تو اور بھی صاف اور بھی واضح نظر آتا ہے
ترغیب اور تذلیل یکجان ہو کر/ زوج بنتے ہیں

نفرتوں کی جھیل میں پاؤں لٹکا کر بیٹھنے سے
ماتھوں پر لکھی عزلتوں کی سیاہیاں ڈھل تو نہیں جاتی ہیں
ہاں مسافتوں کی مایوسیوں کی مٹی
اپنا آپ چھوڑ دیتی ہے
تپے ہوئے تنور سے جس طرح پھولی ہوئی روٹیاں باہر نکلتی ہیں
میرے منھ پر تمانچے مار کر
تمہارے ہاتھوں کی انگلیوں کے نشاں
پھولی ہوئی روٹی کی طرح
میرے منھ پر صد رنگ غبارے چھوڑے جاتے ہیں
تم حق والے لوگ ہو
تم نے مہر کے عوض حق کی بولی جیتی ہے

○

(۴) انٹی کلاک وائز

میری آنکھیں تمہارے تلوے بھی بن جائیں/ تو بھی تمہیں یہ خوف نہیں چھوڑے گا
کہ میں دیکھ تو نہیں سکتی/ جسموں اور فقروں کو
خوشبو کی طرح محسوس تو کر سکتی ہوں

میری ناک اپنے تحفظ کی خاطر/ تمہارے سامنے رگڑ رگڑ کے
بے نشان بھی ہو جائے/ تو تمہیں یہ خوف نہیں چھوڑے گا
کہ میں سونگھ تو نہیں سکتی/ مگر بول تو سکتی ہوں

مرے ہونٹ، تمہاری مجازیت کے گن/ گا گا کر
خشک اور بے روح ہو بھی جائیں/ تو بھی تمہیں یہ خوف نہیں چھوڑے گا
کہ میں بول تو نہیں سکتی/ مگر چل تو سکتی ہوں

مرے پیروں میں زوجیت/ اور شرم و حیا کی بیڑیاں ڈال کر
مجھے مفلوج کر کے بھی/ تمہیں یہ خوف نہیں چھوڑے گا

کہ میں چل تو نہیں سکتی/ مگر سوچ تو سکتی ہوں

آزاد رہنے، زندہ رہنے/ اور مرے سوچنے کا خوف
تمہیں کن کن بلاؤں میں گرفتار کرے گا

○

فہمیدہ ریاض

(۱) ایک لڑکی

سنگ دل رواجوں کی/ یہ عمارت کہنہ
اپنے آپ پر نادم/ اپنے بوجھ سے لرزاں
جس کا ذرہ ذرہ ہے/ خود شکستگی ساماں
سب خمیدہ دیواریں/ سب جھکی ہوئی کڑیاں

سنگ دل رواجوں کے/ خستہ حال زنداں میں
اک صدائے مستانہ/ ایک رقص رندانہ
یہ عمارت کہنہ ٹوٹ بھی تو سکتی ہے
یہ اسیر شہزادی چھوٹ بھی تو سکتی ہے

یہ اسیر شہزادی......!

جبر و خوف کی دختر/ واہموں کی پروردہ
مصلحت سے ہم بستر/ ضعف و یاس کی مادر

جب نجات پائے گی
سانس لے گی درانہ/محورقص رندانہ
اپنی ذات پائے گی

تو ہے وہ زن زندہ/ جس کا جسم شعلہ ہے
جس کی روح آہن ہے/ جس کا نطق گویا ہے
بازوؤں میں قوت ہے/ انگلیوں میں صناعی
ولولوں میں بے باکی
لذتوں کی شیدائی
عشق آشنا عورت
وصل آشنا عورت
مادر خداوندی
آدمی کی محبوبہ

○

(۲) بڑھتی نار

تجھ سے لپٹ کر، اے مری جان
ڈر سے سوکھ گئے مرے آنسو
سہم گئی میری مسکان/ تجھ سے لپٹ کر

میری دو بانہوں میں سمائی ساگر کی بھرپور اٹھان
سارے موسم کھل کھل ہنستے ترے لہو میں گونج رہے ہیں
ترے بدن میں اگن ہوا اور پانی مل کر جھوم رہے ہیں
اجیالے ماتھے پر اگتا پہلی سوچ کا سچا سورج
بڑھتی نار
تو اس دھرتی پر جیون کا سب سے اونچا مان
یہ تیرے بے خوف چمکتے نین، اندھیروں سے انجان
ڈر سے سوکھ گئے مرے آنسو/ سہم گئی مسکان

دیکھو، دیکھو آنے والے پل میں کیا ہونے والا ہے

چاراور سے سرک رہے ہیں کالے، بوجھل اندھے سائے
کیا ایسا ممکن ہے/ ایسا ہو سکتا ہے؟
لہریں بھرتے ساگر کو کوئی پتھرا دے
لچکیلے تن کی گیلی لکڑی میں چتا انگن بھڑکا دے
سورج پر کالک مل دے
نرمل کرنوں کا گلا دبا دے

ایسا ہی ہوتا آیا ہے
ہو سکتا ہے
نہیں، نہیں او دھرتی کی دھی
اپنی شکتی آپ سنبھال
ان بوڑھی کبڑی صدیوں کو ناچ دکھا دے
تانڈو ناچ
اس گندے، ناپاک، بس بھرے، نیلے لہو کو بہہ جانے دے
جس نے جیون بانجھ کیا ہے
سوچ کا سب رس چوس لیا ہے

○

(۳) چادر اور دیواری

حضور میں اس سیاہ چادر کا کیا کروں گی
یہ آپ کیوں مجھ کو بخشتے ہیں بصد عنایت

نہ سوگ میں ہوں کہ اس کو اوڑھوں
غم و الم خلق کو دکھاؤں
نہ روگ میں ہوں کہ اس کی تاریکیوں میں خفت سے ڈوب جاؤں
نہ میں گنہ گار ہوں نہ مجرم
کہ اس سیاہی کی مہر اپنی جبیں پہ ہر حال میں لگاؤں
اگر نہ گستاخ مجھ کو سمجھیں
اگر میں جاں کی امان پاؤں
تو دست بستہ کروں گزارش
کہ بندہ پرور
حضور کے حجلہ معطر میں ایک لاشہ پڑا ہوا ہے
نہ جانے کب کا گلا سڑا ہے
یہ آپ سے رحم چاہتا ہے

حضور اتنا کرم تو کیجئے
سیاہ چادر مجھے نہ دیجئے
سیاہ چادر سے اپنے حجرہ کی بے کفن لاش ڈھانپ دیجئے

کہ اس سے پھوٹی ہے جو عفونت
وہ کوچے کوچے میں ہانپتی ہے
وہ سر پٹکتی ہے چوکھٹوں پر
برہنگی اپنی ڈھانپی ہے
سنیں ذرا دلخراش چیخیں
بنا رہی ہیں عجب ہیولے
جو چادروں میں بھی ہیں برہنہ
یہ کون ہیں؟ جانتے تو ہوں گے
حضور پہچانتے تو ہوں گے
یہ لونڈیاں ہیں
کہ یرغمالی حلال شب بھر رہیں
دم صبح در بدر ہیں
یہ باندیاں ہیں
حضور کے نطفۂ مبارک کے نصف ورثے سے معتبر ہیں
یہ بیبیاں ہیں

کہ زوجگی کا خراج دیجئے
قطار اندر قطار باری کی منتظر ہیں

یہ بچیاں ہیں
کہ جن کے سر پر پھرا جو حضرت کا دست شفقت
تو کم سنی کے لہو سے ریش سپید رنگین ہو گئی ہے
حضور کے حجلۂ معطر میں زندگی خون رو گئی ہے

پڑا ہوا ہے جہاں یہ لاشہ
اب اس تماشہ کو ختم کیجئے
حضور اب اس کو ڈھانپ دیجئے

سیاہ چادر تو بن چکی ہے مری نہیں آپ کی ضرورت
کہ اس زمیں پر وجود میرا نہیں فقط اک نشان شہوت
حیات کی شاہ راہ پر جگمگا رہی ہے مری ذہانت
زمیں کے رخ پر جو ہے پسینہ تو جھلملاتی ہے مری محنت

یہ چار دیواریاں یہ چادر گلی سڑی لاش کو مبارک
کھلی فضاؤں میں بادباں کھول کر بڑھے گا مرا سفینہ
میں آدم نو کی ہمسفر ہوں
کہ جس نے جیتی مری بھروسہ بھری رفاقت

○

پروین شاکر

(۱) مسفٹ

کبھی کبھی میں سوچتی ہوں
مجھ میں لوگوں کو خوش رکھنے کا ملکہ
اتنا کم کیوں ہے
کچھ لفظوں سے کچھ میرے لہجے سے خفا ہیں
پہلے میری ماں / میری مصروفیت سے
نالاں رہتی تھی
اب یہی گلہ مجھ سے میرے بیٹے کو ہے
(رزق کی اندھی دوڑ میں رشتے کتنے پیچھے رہ جاتے ہیں)
جب کہ صورت حال تو یہ ہے
میرا گھر / میرے عورت ہونے کی مجبوری کا
پورا لطف اٹھاتا ہے / ہر صبح
میرے شانوں پر
ذمہ داری کا بوجھا لیکن / پہلے سے بھاری ہوتا ہے
پھر بھی میری پشت پر
نااہلی کا کوب
روز بروز نمایاں ہوتا جاتا ہے

○

(۲) کنیادان

بال صندل کے پانی میں بھیگے ہوئے
جسم چندن کے مس سے دمکتا ہوا
آنکھ خوابوں کی افشاں سے بوجھل بہت
ہونٹ پران کہی کا مزہ
گوری گوری کلائی سے لپٹی ہوئی موتیے کی لڑی
سرخ زرتار جوڑے میں سمٹی ہوئی ایک کچی کلی
گاہے گاہے جھلکتی ہوئی موہنی شکل وہ چاندسی
چوڑیوں کی کھنک
اور پائل کی چھن چھن سے چھنتی ہوئی
کیسی پیاری ہنسی
تس پہ سکھیوں کی وہ چھیڑ کہ
آئینے سے بھی نظریں ملائی نہیں جا سکیں

شامیانے کے پرلی طرف

وقت کے جبر کے سامنے
چپ کھڑی مامتا
جس کے چاروں طرف
تشنہ ہونٹوں، گرسنہ نگاہوں، لٹکتی زبانوں، بدن گیر
غراہٹوں کا عجب غول ہے
اور اسی غول سے
اپنی نازوں کی پالی کی خاطر
بڑے صبر سے
ایک مجبور ہرنی کی صورت وہ چن لائی ہے
اک ذرا کم ضرر بھیڑیا

(۳) بشیرے کی گھر والی

ہے رے تیری کیا اوقات/ دودھ پلانے والے جانوروں میں
اے سب سے کم اوقات/ پرش کی پسلی سے تو تیرا جنم ہوا
اور ہمیشہ پیروں میں تو پہنی گئی/ جب ماں جایا پھلواری میں تتلی ہوتا
تیرے پھول سے ہاتھوں میں/ تیرے قد سے بڑی جھاڑو ہوتی
ماں کا آنچل پکڑے پکڑے/ تجھ کو کتنے کام آجاتے
اپلے تھاپنا/ لکڑی کاٹنا
گائے کی سانی بنانا/ پھر بھی مکھن کی ٹکیہ
ماں نے ہمیشہ بھیا کی روٹی پہ رکھی/ تیرے لئے بس رات کی روٹی
رات کا سالن/ روکھی سوکھی کھاتے
موٹا جھوٹا پہنتے/ تجھ پہ جوانی آئی تو
تیرے باپ کی نفرت تجھ سے اور بڑھی/ تیرے اٹھنے، بیٹھنے، چلنے پھرنے پر
ایسی کڑی نظر رکھی/ جیسے ذرا سی چوک ہوئی
اور تو بھاگ گئی/ سولہواں لگتے ہی
ایک مرد نے اپنے من کا بوجھ/ دوسرے مرد کے تن پہ اتار دیا

بس گھر اور مالک بدلا/ تیری چاکری وہی رہی
بلکہ کچھ اور زیادہ/ اب تیرے ذمے شامل ہے
روٹی کھلانے والے کو/ رات گئے خوش بھی کرنا
اور ہر ساون گابھن ہونا/ پورے دنوں سے گھر کا کام سنبھالتی
پتی کا ساتھ/ بس بستر تک
آگے تیرا کام/ کیسی نوکری ہے
جس میں کوئی دیہاڑی نہیں/ جس میں کوئی چھٹی نہیں
جس میں الگ ہوجانے کی سرے سے کوئی ریت نہیں
ڈھوروں، ڈنگروں کو بھی/ جیٹھ، اساڑ کی دھوپ میں
پیڑ تلے ستانے کی آزادی ہوتی ہے/ تیرے بھاگ میں ایسا کوئی سمے نہیں
تیری جیون پگڈنڈی پر کوئی پیڑ نہیں ہے/ ہے رے
کن کرموں کا پھل ہے تو/ تن بیچے تو کسبی ٹھہرے
من کا سودا کرے اور پتنی کہلائے/ سمے کے ہاتھوں ہوتا رہے گا
کب تک یہ اپمان/ ایک نوالہ روٹی
ایک کٹورے پانی کی خاطر/ دیتی رہے گی کب تک تو بلیدان

○

(۴) تو برمن بلا شدی

کچے ذہن اور کچی عمر کی لڑکیاں/ اپنی خوبی میں
مائع جیسی ہوتی ہیں/ جس برتن میں ڈالی جائیں
اسی شکل میں کیسے مزے سے ڈھل جاتی ہیں
کیسا چھلکنا، کیسا ابلنا اور کہاں کا اڑنا
اور اک میں ہوں...... پتھر اور شوریدہ مزاج
کاسۂ خالی میں بے وجہ سما جانے کی بجائے
اس سے اس قوت سے ٹکرانا چاہوں کہ
ظرف تہی کی گونج سے اس کا بھرم کھل جائے
میں نے آئینے کو کب جھٹلایا ہے/ ہاں...... گہنے مجھ پر بھی اچھے لگتے ہیں
لیکن جب بھی مجھ کو ان کا مول کبھی یاد آتا ہے تو
کنگن بچھو بن جاتے ہیں/ اور پازیبیں ناگ کی صورت میرے پاؤں جکڑ لیتی ہیں
بہت ہی میٹھے بولوں کا جزو اعظم/ جب حالتِ خام میں مجھ کو نظر آ جاتا ہے
دہشت سے مری آنکھیں پھیلنے لگتی ہیں
اور اس خوف سے میری ریڑھ کی ہڈی جمنے لگتی ہے کہ
ان ہی مادرزاد منافق لوگوں میں
مجھ کو ساری عمر بسر کرنی ہے

عورت اور نمک

عزت کی بہت سی قسمیں ہیں/گھونگھٹ، تھپڑ، گندم
عزت کے تابوت میں قید کی میخیں ٹھونکی گئی ہیں
گھر سے لے کر فٹ پاتھ تک ہمارا نہیں
عزت ہمارے گذارے کی بات ہے
عزت کے نیزے سے ہمیں داغا جاتا ہے
عزت کی کنی ہماری زبان سے شروع ہوتی ہے
کوئی رات ہمارا نمک چکھ لے
تو ایک زندگی ہمیں بے ذائقہ روٹی کہا جاتا ہے

یہ کیسا بازار ہے/کہ رنگ ساز ہی پھیکا پڑا ہے
خلا کی ہتھیلی پہ پتنگیں مر رہی ہیں/ میں قید میں بچے جنتی ہوں
جائز اولاد کے لیے زمیں کھلنڈری ہونی چاہیے
تم ڈر میں بچے جنتی ہو اسی لیے آج تمہاری کوئی نسل نہیں
تم جسم کے ایک بند سے پکاری جاتی ہو
تمہاری حیثیت میں تو چال رکھ دی گئی ہے

ایک خوبصورت چال

جھوٹی مسکراہٹ تمہارے لبوں پر تراش دی گئی ہے
تم صدیوں سے نہیں روئیں
کیا ماں ایسی ہوتی ہے/تمہارے بچے پھیکے کیوں پڑے ہیں

تم کس کنبے کی ماں ہو
ریپ کی، قید کی، بٹے ہوئے جسم کی
یا اینٹوں میں چنی ہوئی بیٹیوں کی
بازاروں میں تمہاری بیٹیاں/ اپنے لہو سے بھوک گوندھتی ہیں
اور اپنا گوشت کھاتی ہیں/ یہ تمہاری کون سی آنکھیں ہیں
یہ تمہارے گھر کی دیوار کی کون سی چنائی ہے
تم نے میری ہنسی میں تعارف رکھا
اور اپنے بیٹے کا نام سکہ رائج الوقت

آج تمہاری بیٹی اپنی بیٹیوں سے کہتی ہے
میں اپنی بیٹی کی زبان داغوں گی
لہوتھوکتی عورت دھات نہیں/ چوڑیوں کی چور نہیں
میدان میں میرا حوصلہ ہے/ انگارہ میری خواہش

ہم سر پہ کفن باندھ کے پیدا ہوئے ہیں
کوئی انگھوٹی پہن کر نہیں/ جسے تم چوری کر لو گے

○

شہناز نبی

(۱) معصوم بھیڑیں

اک چراگاہ
سو چراگاہیں
کون ان ریوڑوں سے گھبرائے
پڑ گئیں کم زمینیں اپنی تو
کچھ سفر کچھ حضر کا شغل رہے
کچھ نئی بستیوں سے ربط بڑھے
ان کو آزاد کون کرتا ہے
یہ بہت مطمئن ہیں تھوڑے میں
اک ذرا سا گھما پھرا لاؤ
کچھ ادھر کچھ ادھر چرا لاؤ
بھیڑیں معصوم بے ضرر سی ہیں
جس طرف ہانک دو چلی جائیں

○

(۲) نیا ادھیائے

تمہاری انا کے جھوٹے جنگلوں میں بھٹکنے کا/کوئی شوق نہیں اسے
اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہارے جانے کے بعد
تمہاری جوتیاں حکومت کرتی رہیں گی
تو یہ تمہاری حماقت ہے/گھر کی چھاؤں سے رخصت ہوتے وقت
تمہارا دل نہیں رویا/اسے سفاک تنہائی کے ہاتھوں سونپتے ہوئے
تم نے کچھ نہیں سوچا/آگے کوئی وعدہ نہیں تھا مگر تم گئے
پیچھے فرض پڑا تھا لیکن تم نے مڑ کر نہیں دیکھا
اسے نہتا اور کمزور سمجھ کر چھوڑ گئے
تا کہ اپنی بقا کی جنگ لڑتے لڑتے وہ ہار جائے
مر جائے
اور زندہ بچ جائے تو لوٹنے کے بعد تم
چند افواہوں کے حوالے سے
اسے بن باس لینے پر مجبور کردو
لیکن اگر اپنی انا کے جنگلوں سے نکل کر
تم ادھر آ بھی گئے تو/اس کی انا کا ساگر لہرا رہا ہوگا
جسے تم پار کرنے کی ہمت کبھی نہیں کر پاؤ گے

(۳) انحراف

عجب بنجر زمینیں ہیں
کئی پرتیں کھرچ ڈالی گئیں پھر بھی رہیں گم صم
کسی بھی بیج کو سینے سے لپٹا کر نہیں روئیں
نمونا آشنا مٹی میں ایک انکر نہیں پھوٹا
اڈ کر چھانے والے بادلوں سے بھی نہیں بولیں
تڑپ کر آتی جاتی بجلیاں بھی رہ گئیں ششدر
نگاہوں میں کہیں بھی خوف کا کوندا نہیں لپکا
وہ جن کے بازوؤں نے آسمانوں کو جھکایا ہے
زمیں کی سرکشی کو
آگہی کا نام دینے سے جھجکتے ہیں
وہ اک فرمان کے تابع
تہوں میں کروٹیں لیتے ہوئے موسم کو کیا جانیں
یہ ان کی مزرعیں اپنی نفی کر کے
اب ان کی ذات سے بھی منحرف ہونے کی درپے ہیں
○

بلقیس ظفیر الحسن

پوسٹر نظم

تمہاری طرح اک انسان میں بھی ہوں
مجھے بھی زندگی جینے کا حق اتنا ہی ہے............ جتنا تمہیں ہے
زمیں میرے لیے بھی سخت اتنی ہی ہیں جتنی تم کو لگتی ہے
فلک بھی اتنا ہی مجھ سے پرے ہے
بدلتے موسموں کا رنگ مجھ کو بھی وہی لگتا ہے...... جیسا تم کو لگتا ہے
تمہاری طرح میں بھی نفرتوں سے چاہتوں سے
روز ملتی ہوں
وہ دکھ ہو یا کہ سکھ، مجھ پر بھی ویسا ہی گزرتا ہے
(الگ ہے ساخت جسموں کی مگر دونوں کے جسموں میں
لہو تو ایک جیسا ہے!)
تمہاری طرح اک انساں ہوں
وہ پالتو بلی نہیں، تم جس کو بستر میں سلا کر
اس کی ''خرخر'' سے بہت محظوظ ہوتے ہو
تمہاری طرح مجھ کو بھی خدا نے اک وجود اپنا دیا ہے

کسی کمتر خدا کی خلق کردہ کیوں سمجھتے ہو

تمہارا جو خدا ہے، وہ ہی میرا بھی خدا ہے
تمہاری وضع کردہ زندگی جیتی رہوں...... کیوں چاہتے ہو؟
مجھے محفوظ رکھنے کے بہانے مت تراشو...... شکریہ!
مجھ کو حفاظت اپنی کرنی آ گئی ہے

○

نسیم سید

(۱) آدھی گواہی

عظیم منصف/ ہماری قسمت کی ہر عدالت کا فیصلہ ہے
کہ ہم/ جب اپنے بدن کی بے حرمتی کی فریاد لے کے جائیں
تو اپنا کوئی گواہ لائیں/ گواہ...... ایسی گھڑی کا
جب وحشتوں سے وحشت پناہ مانگے
گواہ...... ایسے گناہ کا/ جس کے تذکرے سے گناہ کانپے
عظیم منصف/ ہمیں کوئی ایسا معجزہ دے
کہ گونگی اندھی سیاہ شب کو گواہیوں کا ہنر سکھائیں
بصیر ہے تو...... خبیر ہے تو/ تجھے خبر ہے
کہ آج تک موت کے علاوہ کوئی نہ اپنا گواہ پایا
ہمیں پہ ٹوٹی قیامتیں بھی/ ہمیں نے ذلت کا بار اٹھایا

کتاب انصاف کے مصنف/ ترے صحیفے
زبور و انجیل ہوں کہ توریت/ عورتیں سب کی باشرف ہیں
سب اپنی اپنی کتاب کی رو سے/ اپنے بارے میں باخبر ہیں

فہیم ہیں----- بالغ النظر ہیں
گواہیاں سب کی معتبر ہیں
تو پھر ہمارے ہی پشت پر ہاتھ کیوں بندھے ہیں؟
ہماری ہی سب گواہیوں پر
یہ بے یقینی کی مہر کیوں ہے
سبھی صحیفوں میں یہ لکھا ہے
تری ترازو کا کوئی پلڑا جھکا نہیں ہے
تو کیا یہ سمجھیں
ہمارا کوئی خدا نہیں ہے

○

(۲) جہیز میں کتاب تھی

جہیز میں کتاب تھی
کتاب میں.................
حقوقِ زوجیت کے سب اصول تھے/ نکتہ نکتہ بات تھی
بات تھی کہ اونٹنی کی پشت پر بھی حکم ہو/ تو بس............!
رضا ورغبت ہی میں بیویوں کی بخشش ونجات ہے
نہ میری وقعت بدن کے باب میں کلام تھا
نہ میری رغبتوں کا کوئی ذکر تھا
نہ میرے مشوروں کی کوئی بات تھی
بے مہار اونٹنی تھی
اونٹنی کی پشت پر لدی ہوئی
میری فکروفہم کی ایک اک کتاب تھی

○

(۳) کچے دھاگے

عورت اپنی ذات کو دانہ دانہ
ایک ہی ہستی کے دھاگے میں گوندھے
گوندھ کے سمجھے
اس کی ذات کی سب بکھری کڑیاں زنجیر ہوئیں
دھاگے کی بس ایک گرہ کے بل پر
اپنی ہستی کی تکمیل کے امکانات پرودے
کچے دھاگے
گرہ لگانے سے کب مضبوط ہوئے

جب چاہیں
جس طرح چاہیں
پھر سے اس تسبیح کو توڑ کے
ذات کو دانہ دانہ کردیں

○

رفیعہ شبنم عابدی

(۱) معمول

سنا ہے یہ/ تمہارے دل کے خوش منظر جزیرے میں
نیا موسم پھر آیا ہے

یہی ہوگا کہ پھر ہر شام
تھوڑی بارشیں ہوں گی/ ہواؤں میں لطافت
بادلوں میں دلکشی/ تازہ شگوفوں میں نمی ہوگی
نیا سبزہ، نئی بالیدگی ہوگی/ عجب اک بے خودی ہوگی

پھر اس کے بعد/ پو پھٹنے سے پہلے
نئے موسم کے بنجارہ پرندے/ کسی ان چھوے ان دیکھے جزیرے کی
طرف پرواز کرلیں گے/ ہمیشہ کی طرح تم پھر
شکستہ دل/ شکستہ جاں
پلٹ آؤ گے گھبرا کر/ اسی ویران بوسیدہ حویلی میں
جو صدیوں سے/ تمہارے اس تھکے ہارے بدن کو
اپنی بانہوں میں سمیٹے/ جی رہی ہے
تمہاری بے وفائی/ جرعہ جرعہ پی رہی ہے

(۲) صدیوں سے صدیوں تک

میں
جو اپنے آپ کو/ بڑی دلیر خود پسند
اور باغی خیال کرتی رہی
کبھی کسی کے آگے نہ جھکی، نہ سہمی، نہ ڈری
زندگی میں دو لمحے ایسے آئے/ جنہوں نے مجھے خوفزدہ کر دیا
ایک وہ لمحہ
جب میری ہتھیلیوں پر حنا کے رنگ مل دیے گئے
زردار دوپٹے اور پھولوں کے بوجھ سے میری سرکشی کو قتل کر دیا گیا
اور رنگ بھرے چاولوں کا تھال الانگ کر
ایک اجنبی دہلیز پار کروائی گئی/ ایک چھوٹی سے آرسی میں
سات پاکیزہ آنچلوں اور 'قل' کے سائے میں
ایک اجنبی چہرہ دکھا کر/ مجھے یہ باور کرایا گیا
کہ وہی میرا مالک ہے/ گویا میں جنس بازار تھی
عزت و ناموس کے عوض/ جسے فروخت کیا گیا
اور تزئین خانہ کے شوق میں جسے خریدا گیا
شرعی بیع نامہ بھی تحریر ہوا
''مہر- مبلغ پانچ ہزار روپے سکہ رائج الوقت''

کیسا لمحہ تھا وہ روح کو لرزہ دینے والا

دوسرا وہ لمحہ/ جب میں نے دیکھا
کہ میری بچی کی آنکھوں کی چمک روز بروز تیز ہوتی جا رہی ہے
فاؤنڈیشن/ آئی لائنز
آئی شیڈ/ مسکارا
لپ اسٹک/ لپ گلووز
بلیچنگ، ویکسنگ/ یہ تمام نام اسے ازبر ہو گئے ہیں
اور گھر کی دیواروں میں آئنوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے
اف خوف کا وہ لمحہ
میرے چاروں طرف ایک شوروغل سا برپا ہوا
رنگ بھرے چاولوں کا تھال
ایک اجنبی دہلیز
ایک چھوٹی سی آرسی
سات پاکیزہ آنچلوں کی چھاؤں
ایک اجنبی چہرہ
اور پھر وہی شرعی بیع نامہ
''مہر-مبلغ پچاس ہزار روپے سکہ رائج الوقت''
جواب میں
وقت کی حشر سامانیوں کا کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ
صدیوں سے صدیوں تک

○

(۳) لجا بھری

میں خوف زدہ کبوتری نہیں/ کہ جس پر کوئی باز بڑی آسانی سے جھپٹ پڑے
میں وہ سہمی سی بلی بھی نہیں/ جو گھر کے کچن میں
دودھ کی پتیلی دیکھ کر میاؤں میاؤں کرتی ہے
میں وہ دبکی ہوئی کتیا بھی نہیں/ چند چھیچھڑوں کے عوض
جو اپنے مالک کے تلوے چاٹتی ہے

مجھے ایسے گھناونے ناموں سے مت پکارو/ میرا دل نفرت سے بھر جاتا ہے
ہمدردی کے پردے میں/ یہ میرے قتل کی سازش ہے جو برسوں سے چلی آرہی ہے
لیکن میں/ اپنے قاتلوں کے چہرے
بہت اچھی طرح پہچانتی ہوں/ ان میں کوئی میرا مسیحا نہیں
یہ تو شیئر بازار کے وہ دلال ہیں/ جو انسانیت اور حقوق نسواں کی بولی لگا کر
مجھے بیچنا اور اپنا دھندہ چلانا چاہتے ہیں

میرے ماتھے پہ کوئی اشتہار نہ چپکاؤ/ مظلومیت کا، محرومیت کا، ناانصافی کا
میں نے مقدس کتابیں پڑھی ہیں/ اور اپنی قیمت خوب جانتی ہوں

○

(۱) ٹوٹتی قدروں کا درد

ذہن مفلوج ہے روح بے چین ہے/ اور احساس میں آگ ہی آگ ہے
دل کی دنیا ہے ویران کچھ اس طرح/ جیسے اک مقبرہ
جو خود اپنے تعفن میں لپٹا ہوا/ اپنے ہی آپ سے سخت بے زار ہے
کچھ سوالات ہیں جن سے دو چار ہے/ زندگی سر برہنہ بھٹکتی ہے کیوں
آدمیت کفن اوڑھے سوئی ہے کیوں/ آدمی
اپنی تازہ تمنا کے جنگل میں ہے/ خود سری کی خطرناک دلدل میں ہے
کوئی انسانیت کا پجاری نہیں/ اب کہیں مذہبی دوست داری نہیں
اب خدا کی عطا/ روشنی کے پیمبر نہیں آئیں گے
خود روی کے اندھیرے میں گم ہو گئے/ وہ سبھی فلسفے
جو سکھاتے رہے آدمیت کا فن/ زندگی کا چلن
بے یقینی کی جلتی ہوئی دھوپ میں/ زندگی کب تلک سر برہنہ رہے

(۲) حاصل

دل و دماغ میں اکثر سوال اٹھتا ہے
کہ اس زمیں سے محبت کہاں گئی آخر
ہوا ہے پیدا جب انسان دردِ دل کے لئے
تو اس کی اپنی حقیقت کہاں گئی آخر

کچھ اتنا پھیل گیا ہے عداوتوں کا غبار
کسی نظر میں مروت نظر نہیں آتی
ہر ایک ذہن میں نفرت کی جنگ جاری ہے
بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی

سبھی ہیں اپنے مفادات کے نشے میں مگن
کہاں ہے آج وہ انسان دوستی کا رواج
کہاں ہے آج مذاہب کی کارفرمائی
بنالیا ہے سبھی نے منافقت کا مزاج

سب اپنے اپنے اصولوں کو بھول بیٹھے ہیں
فریب و مکر کی تصویر بن گئی دنیا
نہیں ہے کوئی حقیقت کا چاہنے والا
سبھی کے پاؤں کی زنجیر بن گئی دنیا

یہ دنیا جس میں کوئی باوفا نہیں ملتا
کوئی نظر کوئی دل باصفا نہیں ملتا
یہاں جو سب کو محبت ملے تو کیا ہوگا
نظر نظر سے جھلکتا ہوا خدا ہوگا

○

URDU NAZMON KA EHTIJAJI AAHANG

Compiled By

SHEHZAD ANJUM BURHANI

اردو شاعری میں احتجاجی آہنگ کی روایت خاصی توانا اور قدیم ہے۔ شاعری
یوں بھی کسی نہ کسی طرح پر شاعر کا ردعمل ہی ہوتی ہے۔ یہ ردعمل جب شدت اختیار کرلیتا
ہے تو شاعری میں احتجاج کی لے پیدا ہو جاتی ہے۔

شہزاد انجم نے احتجاجی نظموں پر تحقیقی مقالہ تحریر کیا ہے اور نوجوان شاعر بھی ہیں۔
اس لیے اس طرح کی نظموں کا انتخاب ان سے بہتر کوئی دوسرا کر بھی نہیں سکتا ہے۔ یہ
انتخاب اس معنی میں اہم اور دوسرے انتخابات سے ممتاز ہے کہ مرتب نے احتجاجی لہجہ
کی سطحی اور سپاٹ بیانیہ نظموں کو نظر انداز کرتے ہوئے استعاراتی اظہار کی اچھی
اور بڑی نظموں کو ہی منتخب کیا ہے، جس کا خیال عموماً مرتبین نہیں رکھتے اور مقبول و مشہور
نظموں کو ہی اپنے انتخاب میں جگہ دیتے ہیں۔

راشد، اختر الایمان، مجید امجد، عمیق حنفی اور ان جیسے دوسرے شاعروں کی نظموں
میں احتجاج کی لے تلاش کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ مرتب کس قدر ذہین، باذوق اور
شاعری کی سمجھ رکھنے کے ساتھ ساتھ نئے پن کی تلاش میں بھی رہتا ہے۔ اس قسم کے
بہت سے انتخابات شائع ہوتے رہتے ہیں، جن میں محض عوام کے حافظے میں محفوظ
اکہری اور چالو قسم کی نظمیں ہی ہوتی ہیں لیکن شہزاد انجم نے مختلف قسم کی نظموں کا انتخاب
کر کے ایک نئی راہ نکالی ہے۔ امید ہے کہ اس انتخاب کے ذریعہ مستقبل میں ایک نئی
روایت بھی قائم ہوگی۔

مہتاب حیدر نقوی

brown book
publications pvt. ltd.
N-139C, First Floor, Abul Fazal Enclave
Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025
Mob: +91-9818897975, 7290906131
E-mail: brownbookpublications@gmail.com
Website: http://brownbooks.in

₹ 200/-